میکسم گورکی

عالمی ادب سے انتخاب

افسانے ۔ کہانیاں

میکسم گورکی

افسانے اور کہانیاں۔ عالمی ادب سے انتخاب

1
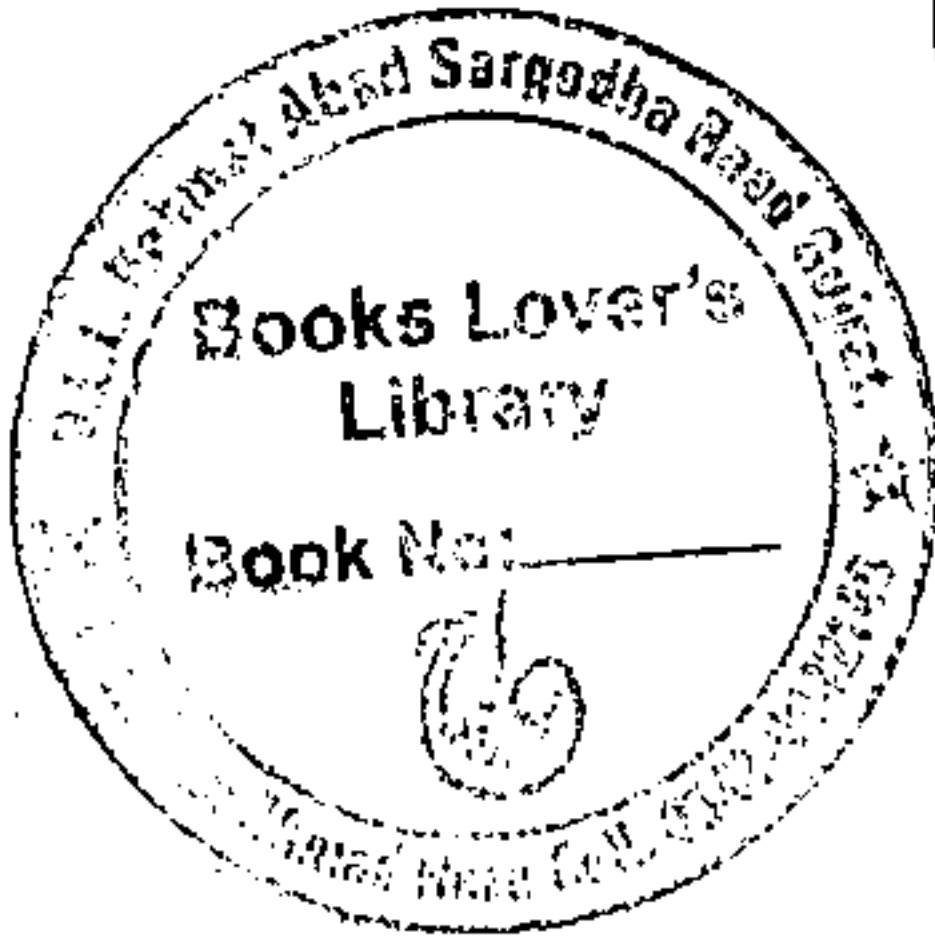
ترتیب
منصور بخاری

گوشۂ ادب

جناح روڈ۔ کوئٹہ (پاکستان)

فون 092-81-2820375 فیکس 092-81-2837672

Web:- goshaeadab.com

E-mail goshaeadab@yahoo.com

فہرست

میکسم گورکی

وصیت

ٹڈے اپنا راگ الاپ رہے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہزاروں دھات کے بنے ہوئے تار زیتون کے درختوں کے گھنے پتوں کے درمیان ادھر سے ادھر تک پھیلے ہوئے ہیں، ہوا سخت پتوں کو ہلاتی ہے، پتے ان تاروں کو چھوتے ہیں اور یہ سبک اور مسلسل لمس فضا کو مخمور کن آوازوں سے معمور کر رہا ہے۔ اسے موسیقی تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے غیر مرئی ہاتھ سینکڑوں غیر مرئی بربطوں کے سر ٹھیک کر رہے ہوں۔ اور آدمی ایک تناؤ کی سی کیفیت میں منتظر ہے کہ کب یہ سر ٹھیک کرنے کا عمل ختم ہو اور کب ایک تار کے سازوں کا عظیم الشان آرکسٹرا سورج، سمندر اور آکاش کی شان میں ایک ترانۂ فتح کی دھن چھیڑے۔

ہوا چل رہی ہے اور درختوں کو اس طرح ہلا رہی ہے کہ ان کی متحرک پھننگیں پہاڑ سے سمندر کی جانب اترتی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں۔ لہریں ایک تال کے ساتھ، بھاری پن سے پتھریلے ساحل سے سر ٹکرا رہی ہیں۔ سمندر جیتے جیتے، سفید جھاگوں سے بھرا ہوا ہے جو چڑیوں کے ایک بڑے سے جھنڈ سے مشابہ ہیں جو اس کی نیلی سطح پر بیٹھی ہوئی ہوں۔ سارے کے سارے جھاگ ایک ہی سمت میں بہتے ہیں اور سمندر کی گہرائیوں میں ڈوب کر ایک دفعہ پھر ایک خفیف سی آواز کے ساتھ ابھر آتے ہیں۔ اور دو

کشتیاں، جو خود بھی دو خاکستری چڑیوں سے مشابہ ہیں، اپنے تہرے تہرے بادبانوں کو بلند کئے افق پر اچھل رہی ہیں گویا ان جھاگوں کو اپنے پیچھے آنے کی ترغیب دے رہی ہوں۔ پورا منظر ایک دور دراز، نیم فراموش شدہ خواب کی طرح، حقیقت سے مشابہت نہیں رکھتا۔

''سورج ڈوبتے تک جھکڑ چل جائے گا!'' چھوٹے سے سنگ ریزوں کے ساحل پر چٹانوں کے سائے میں بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے مچھیرے نے کہا۔

لہروں نے سمندری گھاس پھونس کے بھورے، پیلے اور سبز گٹھوں کو ساحل پر لا ڈالا ہے اور اب وہ تپتے ہوئے سورج کے نیچے گرم سنگ ریزوں پر پڑے ہیں اور نمکین ہوا کو آیوڈین کی تیز بو سے بھر رہے ہیں۔ ننھی ننھی لہر دار موجیں ساحل پر ایک دوسرے سے اٹکھلیاں کر رہی ہیں۔

بوڑھا مچھیرا اپنے جھرمرائے ہوئے چہرے، اپنی طوطے کی چونچ جیسی ناک اور اپنی گول گول اور بلا شبہ بہت تیز آنکھوں کے باعث، جو اس کی کھال کی تاریک تہوں کے درمیان چھپی ہوئی ہیں، ایک پرندے سے مشابہ ہے۔ اس کی گانٹھ دار اور سوکھی ہوئی انگلیاں اس کے گھٹنوں پر رکھی ہوئی ہیں۔

''سینیور، کوئی پچاس برس پہلے کی بات ہے'' بوڑھے نے ایک ایسی آواز میں کہنا شروع کیا جو لہروں کی سرسراہٹ اور ٹڈوں کے سنگیت سے ہم آہنگ تھی ''ایک دفعہ ایک ایسا ہی چمکیلا اور خوبصورت دن تھا جب ہر چیز ہنستی اور گاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت میرا باپ چالیس سال کا تھا اور میری عمر سولہ سال تھی۔ میں ایک لڑکی سے پیار کرتا تھا جیسا کہ ہمارے یہاں کے سے عمدہ سورج کے نیچے ایک سولہ سالہ لڑکے کے لیے بالکل فطری بات تھی۔

''چلو گیویدو، میرے باپ نے مجھ سے کہا ''پیزونی پکڑنے چلتے ہیں''...... ہمارے ہاں پیزونی، سینیور ایک بڑی مزے دار اور نازک سی، گلابی پروں والی مچھلی ہوتی ہے...... وہ مونگا مچھلی بھی کہلاتی ہے کیونکہ وہ جہاں مونگے ہوتے ہیں وہیں، بہت

گہرے پانی میں، پائی جاتی ہے۔ اور بڑی خوبصورت بھی ہوتی ہے وہ...... اسے لنگر ڈال کر ایک وزن دار کانٹے سے پکڑا جاتا ہے۔

''سو ہم چل پڑے اور ہمیں پوری امید تھی کہ بہت سی مچھلیاں پکڑیں گے۔ میرا باپ بہت مضبوط آدمی تھا اور بڑا مشاق مچھیرا، لیکن اس سفر سے کچھ ہی دن پہلے وہ بیمار پڑ چکا تھا، اسی لیے اس کا سینہ دکھتا تھا اور اس کی انگلیاں گٹھیا کے سبب، جو مچھیروں کی بیماری ہے، مڑی مڑی سی ہوگئی تھیں۔

''یہ ملائم ملائم ہوا جو اس وقت سمندر کی طرف سے ہمارے پاس اس قدر تھپکیاں سی دیتی ہوئی آرہی ہے اور گویا ہمیں دھیرے دھیرے سمندر کی طرف دھکیل رہی ہے بڑی دھوکہ باز اور چالاک ہوا ہے۔ وہاں، سمندر پر، یہ آدمی کو ایک دم آلیتی ہے اور اچانک اس پر ٹوٹ پڑتی ہے گویا آدمی نے اس کو کوئی نقصان پہنچایا ہو۔ وہ فوراً کشتی کو الٹ ڈالتی ہے اور بعض دفعہ اس کا تلا اوپر کی طرف ہوتا ہے اور آدمی پانی کے اندر۔ اور یہ سب کچھ اتنے آناً فاناً ہو جاتا ہے کہ آدمی کو کوسنے پیٹنے یا خدا کا نام لینے کا بھی وقت نہیں ملتا اور وہ بے بس اور مجبور دور فاصلے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس ہوا سے زیادہ تو لٹیرا ہی ایمان دار ہوتا ہے۔ لیکن خیر انسان تو فطرت کے عناصر سے زیادہ ایمان دار ہوتے ہی ہیں۔

''ہاں تو ایسی ہی ہوا نے ساحل سے کوئی چار کلو میٹر دور اس دن ہمیں آلیا...... اور یہ کوئی ایسا زیادہ فاصلہ نہیں ہے جیسا کہ آپ دیکھتے ہی ہیں...... اس نے بزدل اور بدمعاش کی طرح بے خبری میں ہم پر حملہ کیا۔

''گیو یدو، میرے باپ نے اپنی ٹیڑھی انگلیوں میں چپو کو پکڑتے ہوئے چلا کر کہا۔ 'گیو یدو! قدم جمائے، رہو! جلدی، لنگر!'

'لیکن جتنے جتنے میں لنگر تلاش کروں تیز ہوا نے میرے باپ کے ہاتھ سے چپو چھین کر پھینک دیا اور اس کے سینے پر ایسی زبردست چوٹ لگائی کہ وہ بے ہوش ہو، لڑکھڑاتا ہوا کشتی کے اندر جا گرا۔ میرے پاس اس کی مدد کرنے کے لیے وقت نہیں تھا

کیونکہ ہمیں کسی بھی لمحے ڈوبنے کا خطرہ تھا۔ ہر چیز چشم زدن میں ہوگئی۔ جس وقت تک میں ہاتھ میں چپولوں ہم ہوا کے تھپیڑے کھاتے بہے چلے جا رہے تھے اور چاروں طرف سے ہم پر پھوار پڑ رہی تھی کیونکہ ہوا لہروں کے اوپر سے کف اور جھاگ اٹھا اٹھا کر اسے ہم پر اس طرح چھڑک رہی تھی جیسے پادری پانی چھڑکتا ہے، بس فرق اتنا تھا کہ وہ پادری سے بہت زیادہ زور شور کے ساتھ یہ کام کر رہی تھی اور اس کا مقصد ہمارے گناہوں کو دھونا نہیں تھا۔

'یہ معاملہ گمبھیر ہے، بیٹے میرے!' میرے باپ نے ہوش میں آنے کے بعد کہا۔ اس نے ساحل کی طرف دیکھا۔ 'بڑا لمبا چلنے والا ہے، میری جان!'، اس نے کہا۔

'جب آدمی جوان ہوتا ہے تو اسے آسانی سے خطرے کا یقین نہیں آتا۔ میں نے جان پر کھیل کر کشتی کھینے کی کوشش کی اور ہر وہ چیز کی جو ایک ملاح نازک موقعوں پر کرتا ہے جب ہوا...... وہ خبیث شیطانوں کا سانس ...... بڑی مہربانی سے اس کے لیے ہزاروں قبریں کھودتی ہوئی ہوتی ہے اور بالکل مفت اس کے لیے فاتحہ خوانی کرتی ہے۔

"نچلے بیٹھو، گھیدو، میرے باپ نے مسکرا کر اپنے سر سے پانی جھٹکتے ہوئے کہا 'سمندر کو دیا سلائیوں سے کھودنے کا کیا فائدہ؟ اپنی طاقت بچائے رکھو ورنہ ہمارے گھر والوں کا تمہارے لیے انتظار کرنا بے سود ہی ہوگا......

'سبز لہریں ہماری کشتی کو اس طرح اچھال رہی تھیں جیسے بچے گیند کو اچھالتے ہیں۔ وہ کشتی کے دونوں پہلوؤں پر چڑھ چڑھ آتی تھیں، ہمارے سروں سے اوپر اٹھ جاتی تھیں اور ہمیں بری طرح ہلا رہی تھیں اور خوب زور زور سے گرج رہی تھیں۔ ہم کبھی منہ پھاڑے ہوئے گڑھوں میں گر پڑتے تھے اور ساحل تیزی سے ہم سے دور ہوتا جا رہا تھا اور ہماری کشتی کے ساتھ ساتھ وہ بھی ناچتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

'ممکن ہے تم خشکی پر پہنچ سکو لیکن میں نہیں پہنچ سکوں گا!، میرے باپ نے مجھ سے کہا۔ 'غور سے سنو اور میں تمہیں مچھلی پکڑنے کے اور کام کے متعلق وہ سب کچھ بتاتا ہوں جو تمہیں جاننا چاہیے......

'اور وہ مختلف مچھلیوں کے طور طریقوں کے متعلق اور انہیں کب، کہاں اور کیسے پکڑنا چاہیے اس کے متعلق جو کچھ جانتا تھا وہ سب اس نے مجھے بتانا شروع کیا۔

'بابا، کیا اس وقت دعا مانگنا بہتر نہ ہوگا؟، میں نے یہ دیکھ کر کہ ہم کس بری طرح پھنس گئے تھے تجویز پیش کی۔ ہم سفید شکاری کتوں کے ایک غول میں پھنسے ہوئے دو خرگوشوں کی طرح تھے اور یہ شکاری کتے ہر طرف سے ہمیں دانت دکھا رہے تھے۔

'خدا سب کچھ دیکھتا ہے' اس نے کہا وہ جانتا ہے کہ وہ انسان جنہیں اس نے خشکی پر رہنے کے لیے پیدا کیا ہے اس وقت سمندر پر مر رہے ہیں اور ان میں سے ایک کے لیے، جو نجات کی امید کھو چکا ہے، ضروری ہے کہ اپنا تمام علم اپنے بیٹے کو دے۔ کام دھرتی کے لیے بھی ضروری ہے اور انسانوں کے لیے بھی۔ خدا اس بات کو سمجھتا ہے......'

اور جب وہ مجھے اپنے پیشے کے متعلق سب کچھ بتا چکا تو اس نے مجھے وہ باتیں بتائیں جو آدمی کو اپنے ہم جنسوں کے ساتھ صلح سے رہنے کے لیے جاننی ضروری ہیں۔

یہ کیا وقت ہے مجھے سکھانے کا، میں نے کہا دھرتی پر تو تم نے کبھی ایسا کیا نہیں!،

دھرتی پر میں نے کبھی موت کو اپنے اتنے نزدیک محسوس نہیں کیا تھا......،

ہوا درندے کی طرح دھاڑ رہی تھی اور موجوں کی گرج اتنی زوردار تھی کہ بابا کو مجھ سے بات کرنے کے لیے چیخنا پڑ رہا تھا۔

لوگوں سے ہمیشہ اس طرح برتاؤ کرو گویا وہ نہ تم سے بہتر ہیں نہ بدتر......اور یہ ٹھیک بات ہوگی! نواب رئیس اور مچھیرے، پادری اور سپاہی...... سب ایک ہی جسم کے حصے ہیں اور تم بھی جسم کا اسی قدر ضروری حصہ ہو جیسے اور لوگ ہیں۔ کبھی کسی شخص کی طرف یہ سوچ کر مت بڑھو کہ اس کے اندر بھلائی سے زیادہ برائی ہے۔ یہ سمجھو کہ اس میں بھلائی زیادہ ہے اور تم ہمیشہ ایسا ہی پاؤ گے۔ لوگ اسی طرح کا برتاؤ کرتے ہیں جیسی ان سے توقع کی جاتی ہے......،

ظاہر ہے کہ اس نے یہ سب باتیں ایک ہی دفعہ میں نہیں کہہ دیں۔ ہم لوگ

موجوں کے ہاتھوں ادھر سے ادھر اچھالے جا رہے تھے، کبھی بہت نیچے جا پڑتے تھے تو کبھی خوب اونچائی پر پہنچ جاتے تھے اور اس حالت میں پھوار اور جھین کے درمیان اس کے الفاظ مجھ تک پہنچ رہے تھے۔ اس نے جو کچھ کہا اس میں سے بہت کچھ مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی ہوا اڑا کر لے گئی اور بہت کچھ میں سمجھا نہیں کیونکہ، سینیور، جب موت سر پر کھڑی ہو تو کوئی کیسے سیکھ سکتا ہے؟ میں ڈرا ہوا تھا، میں نے اس سے پہلے سمندر کو کبھی اتنی غضبناک کیفیت میں نہیں دیکھا تھا اور نہ کبھی اس پر اتنا لاچار اور بے بس محسوس کیا تھا۔ اور میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اس وقت کی بات ہے یا بعد میں جب مجھے ان گھڑیوں کا خیال آیا اس وقت کی ہے کہ مجھے ایک ایسا احساس ہوا جو میں تمام عمر نہیں بھول سکتا۔

میں اپنے باپ کو کشتی کے اندر بیٹھا ہوا دیکھ سکتا ہوں، جیسے کل کی بات ہو۔ اس کے نحیف بازو پھیلے ہوئے ہیں کیونکہ وہ اپنی ٹیڑھی، مڑی ہوئی انگلیوں سے کشتی کے پہلوؤں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے، لہریں اس کی ٹوپی کو بہا کر لے گئی ہیں اور دائیں، بائیں، آمنے سامنے ہر طرف سے اس کے شانوں اور سر پر تھپیڑے لگا رہی ہیں اور ہر دفعہ وہ اپنے سر کو جھٹکا دیتا ہے، ناک سڑکتا ہے اور مجھ سے چیخ کر کچھ کہتا ہے۔ پانی میں شرابور، وہ سکڑ کر کچھ چھوٹا سا معلوم ہو رہا ہے اور اس کی آنکھیں خوف سے، یا شاید تکلیف سے، پھیل گئی ہیں...... شاید تکلیف ہی سے۔

سنو!، وہ چیخ کر کہتا ہے۔ 'تم میری بات سن سکتے ہو؟'

کبھی کبھی میں جواب دیتا ہوں:

'ہاں سن سکتا ہوں!'

'یاد رکھو، ساری نیکی، ساری بھلائی کا سرچشمہ انسان ہے!'

''میں یاد رکھوں گا!، میں جواب دیتا ہوں۔

خشکی پر اس نے کبھی مجھ سے اس طرح کی باتیں نہیں کی تھیں۔ وہ ہمیشہ بہت مہربان اور خوش دل رہتا تھا مگر مجھے وہاں یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے بے اعتباری کی نظر سے اور کچھ مذاق اڑانے کے انداز سے دیکھتا ہے اور میں اس کے نزدیک ابھی تک بچہ

ہوں۔ بعض دفعہ اس سے میں آزردہ خاطر ہو جاتا تھا کیونکہ جوانی میں آدمی کے جذبات کو بڑی جلدی ٹھیس لگتی ہے۔

"اس کی چیخوں نے میرے خوف کو کچھ کم کر دیا تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے ہر بات اتنی اچھی طرح یاد ہے۔"

بوڑھا مچھیرا خاموش ہو گیا، اس کی نگاہیں کف سے بھرے ہوئے سمندر پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ مسکرایا اور آنکھ مار کر اپنی بات دوبارہ شروع کر دی:

"سینیور، میں بہت عرصے سے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ کسی کو یاد کرنا اسے سمجھنے کے برابر ہے اور آدمی جتنا زیادہ سمجھتا ہے وہ اتنی ہی زیادہ بھلائی دیکھ سکتا ہے، یقین مانئے، یہ بالکل سچی بات ہے!

"مجھے اس کا پیارا چہرہ یاد ہے، بالکل پانی میں شرابور اور وہ اس کی بڑی بڑی آنکھیں ٹکٹکی باندھے مجھے محبت اور سنجیدگی سے دیکھتی ہوئی اور ان کی دیکھت کچھ ایسی تھی کہ مجھے اس وقت یہ یقین ہو گیا کہ میں اس دن نہیں مروں گا۔ میں ڈرا ہوا تو ضرور تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ میں مروں گا نہیں۔

آخر کار ظاہر ہے ہماری کشتی الٹ ہی گئی۔ تب ہم دونوں کف نکالتے ہوئے پانی میں پڑے ہوئے تھے اور جھاگ ہمیں اندھا کئے دے رہا تھا، لہریں ہمارے جسموں کو اچھال رہی تھیں اور انہیں ہماری کشتی کے تلے سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہم نے کشتی کے کھویوں والے تختے سے ہر ممکن چیز باندھ دی تھی اور اب ہم اپنے ہاتھوں میں رسیاں پکڑے ہوئے تھے اور اور جب تک ہمارے دم میں دم تھا ہم اپنی کشتی سے علیحدہ ہونے والے نہیں تھے لیکن اپنے سر پانی سے باہر رکھنا بہت مشکل تھا۔ کئی دفعہ میں اور میرا باپ دونوں کشتی کے تلے سے ٹکرا گئے اور پھر لہروں نے ہمیں بہا کر الگ ہٹا دیا۔ سب سے زیادہ بری بات یہ ہے کہ سر چکرانے لگتا ہے، کانوں سے سنائی اور آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا، کانوں میں پانی بھر جاتا ہے اور سیروں پانی پیٹ کے اندر بھی چلا جاتا ہے۔

یہ حالت بہت دیر تک رہی، تقریباً سات گھنٹے تک، یہاں تک کہ ہوا کا رخ

یکبارگی پلٹ گیا، وہ بہت زور زور سے ساحل کی طرف چلنے لگی اور ہمیں تیزی سے خشکی کی طرف لے چلی۔

قدم جمائے رہو، میں خوش ہو کر چلایا۔

بابا نے جواب میں چلا کر کوئی بات کہی مگر میں فقط ایک لفظ سن سکا:

''چٹانیں......

''وہ ساحل کی چٹانوں کے متعلق سوچ رہا تھا لیکن وہ ابھی تک خاصی دور تھیں اور میں نے اس کی بات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ لیکن وہ مجھ سے بہتر جانتا تھا۔ ہم پانی کے پہاڑوں کے درمیان، بالکل بے بس اور شل اور سن، آگے بڑھے چلے جا رہے تھے جو بڑی بے دردی سے ہمارے چوٹیں لگا رہی تھی۔ بہت دیر تک یہی سلسلہ چلتا رہا مگر آخر کار ساحل کی سیاہ چٹانیں نظر آنے لگیں۔ اس کے بعد ہر چیز بہت سرعت کے ساتھ ہو گئی۔ جھومتی ہوئی چٹانیں، پانی کے اوپر جھکی ہوئی ہماری طرف بڑھیں، وہ ہمارے اوپر گر پڑنے کو تیار تھیں۔ سفید موجوں نے ہمارے جسموں کو ایک دفعہ آگے کی طرف اچھالا، پھر دوسری دفعہ اچھالا، ہماری کشتی اس طرح چرمرائی جیسے جوتے کی ایڑی کے نیچے بادام یا اخروٹ اور لہروں نے مجھے کشتی سے دور جا پھینکا۔ میں نے چٹانوں کی چاقو جیسی تیز پسلیاں اپنے سامنے ابھرتی ہوئی دیکھیں، اپنے باپ کے سر کو خود اپنے سر سے بہت اونچا اٹھا ہوا دیکھا اور پھر یہ دیکھا کہ وہ اٹھا کر ان شیطانوں کے پنجوں سے اوپر پہنچا دیا گیا ہے، ایک یا دو گھنٹے کے بعد اسے وہاں سے اٹھایا گیا، اس کی پیٹھ اور کھوپڑی بری طرح ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس کے سر کا زخم اتنا بڑا تھا کہ بھیجے کا کچھ حصہ اس میں سے نکل کر بہہ گیا تھا، اور زخم کے اندر سرخ سرخ رگیں اس طرح گزر رہی تھیں جیسے سنگِ مرمر یا پانی کے جھاگوں میں خون ملا ہوا ہو۔ اس کا جسم بری طرح کچلا ہوا اور زخمی تھا لیکن اس کا چہرہ صاف اور پرسکون تھا اور اس کی آنکھیں زور سے بند تھیں۔

''میں؟ ہاں میں بھی بری طرح زخمی ہوا تھا اور جب مجھے گھسیٹ کر ساحل پر لایا گیا تو میں بے ہوش تھا۔ ہم خشکی پر امالغی کے اس پار پہنچ لیے تھے جو ہمارے گاؤں

سے بہت دور ہے مگر ظاہر ہے وہاں کے لوگ بھی مچھیرے ہی ہیں اور ایسی چیزوں پر انہیں کوئی تعجب نہیں ہوتا بلکہ وہ انہیں مہربان اور ملائم دل بنا دیتی ہیں۔ وہ لوگ جو خطروں سے گھری ہوئی زندگی گزارتے ہیں ہمیشہ نرم دل ہوتے ہیں!

"مجھے خیال ہے کہ میں اس احساس کا اچھی طرح اظہار نہیں کر سکا جو اپنے باپ کے ساتھ آخری گفتگو نے میرے اندر پیدا کیا تھا، وہ احساس جو میں اکاون سال سے اپنے سینے کے اندر لیے ہوئے ہوں۔ اس کے اظہار کے لیے خاص قسم کے الفاظ کی ضرورت ہے بلکہ شاید الفاظ کی بھی نہیں سنگیت کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم مچھیرے اتنے ہی سیدھے سادے ہیں جتنی مچھلیاں، ہم اتنی اچھی طرح گفتگو نہیں کر سکتے جیسا ہم چاہتے ہیں! ہم جتنا اظہار کر سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ جانتے اور محسوس کرتے ہیں۔

"اہم بات یہ ہے کہ وہ، میرا باپ، اچھی طرح یہ جانتے ہوئے کہ وہ موت سے نہیں بچ سکے گا اپنی موت کی گھڑی میں خوف زدہ نہیں ہوا اور وہ مجھے، اپنے بیٹے کو، نہیں بھولا اور کسی نہ کسی طرح اس نے اپنے اندر مجھے وہ سب کچھ بتانے کی طاقت پیدا کر لی جو اس کے خیال میں مجھے جاننا چاہئے تھا۔ میں سڑسٹھ سال سے اس دنیا میں رہ رہا ہوں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت اس نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا وہ سب صحیح ہے!"

بوڑھے نے اپنی بنی ہوئی ٹوپی اتار لی جو پہلے کبھی سرخ رہی ہوگی اور اب بھورے رنگ کی ہو گئی تھی، اپنا پائپ نکالا اور اپنا ننگا، تمتمایا ہوا سر جھکا کر زور دے کے کہنے لگا:

"ہاں یہ سب سچ ہے، سینیور! لوگ ویسے ہی ہوتے ہیں جیسا آپ انہیں دیکھنا چاہتے ہیں، ان کو لطف اور مہربانی کی نظر سے دیکھئے تو آپ ان کے اور اپنے دونوں کے حق میں بھلائی کریں گے۔ وہ بہتر ہو جائیں گے اور خود آپ بھی۔ سیدھی بات ہے، ٹھیک ہے نا؟"

ہوا کی تیزی مسلسل بڑھ رہی تھی، موجیں زیادہ اونچی اٹھتی جا رہی تھیں اور زیادہ تیز اور زیادہ سفید ہوتی جا رہی تھیں، پرندوں کے جھنڈ سمندر کی سطح پر نمودار ہو کر

تیزی سے دور تیرتے جا رہے تھے اور تہرے بادبانوں والی دونوں کشتیاں افق کے نیلگوں کنارے کے پیچھے چھپ چکی تھیں۔

جزیرے کے ڈھلواں ساحل جھاگ کی وجہ سے بالکل سفید ہو رہے تھے، گہرے نیلے رنگ کا سمندر ہیجانی کیفیت میں مبتلا معلوم ہوتا تھا اور ٹڈے اپنا ان تھک، پرجوش راگ الاپے جا رہے تھے۔

میکسم گورکی

زندہ باد پارما

جینوآ میں ریلوے اسٹیشن کے سامنے والے چھوٹے سے چوک میں لوگوں کا ایک بہت بڑا مجمع جمع ہو گیا تھا۔ ان میں زیادہ تر مزدور تھے لیکن کافی تعداد خوب اچھی طرح کھائے پئے، خوش پوشاک لوگوں کی بھی تھی۔ مجمع کے سامنے میونسپلٹی کے اراکین کھڑے تھے اور ان کے سروں کے اوپر شہر کا بھاری، ریشمی جھنڈا لہرا رہا تھا جس پر فنکارانہ خوبصورتی سے کشیدہ بنا ہوا تھا، اور اس کے قریب ہی مزدوروں کی تنظیموں کے رنگا رنگ جھنڈے اپنے سر ہلا رہے تھے۔ سنہری پھندنے، ڈوریاں اور جھالر جگمگ جگمگ کر رہے تھے، جھنڈوں کے بانسوں کے سرے چمک رہے تھے، ریشم سرسرا رہا تھا اور خوش وخرم مجمع میں سے ایک مدہم غنغناہٹ کی آواز نکل رہی تھی جو سرود خوانوں کی ٹولی کے دھیمے سروں میں گانے سے مشابہ تھی۔

اوپر کولمبس کا مجسمہ اپنی بلند کرسی پر استادہ تھا۔ وہ خوابوں کی دنیا کا باسی جس نے اپنے ایمان و یقین کی وجہ سے اتنی تکلیفیں اٹھائیں اور اسی ایمان و یقین کی بدولت کامیاب بھی ہوا۔ آج وہ بھی لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور اس کے مرمریں لب یہ کہتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے:

"صرف وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں جو یقین وایمان رکھتے ہیں۔"

موسیقاروں نے اپنے ساز کولمبس کے پیروں کے پاس، اس کی کرسی کے

چاروں طرف، رکھ دئے تھے اور دھوپ میں پیتل سونے کی مانند جگمگا رہا تھا۔

اسٹیشن کی بھاری، مرمریں عمارت ایک گھیرے ہوتے ہوئے نیم دائرے کی شکل میں کھڑی تھی اور اپنے بازو اس طرح پھیلائے ہوئے تھی گویا منتظر مجمع سے ہم آغوش ہونے کی خواہش مند ہو۔ بندرگاہ سے دخانی جہازوں کے بھاری بھاری سانسوں کی اور جہازوں کے دھکیلوؤں کی پانی کو بلونے کی دبی دبی آوازیں اور زنجیروں کی کھڑ کھڑاہٹ، سیٹیاں اور شور وغل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور تپتے ہوئے سورج کے نیچے چوک میں گرمی، گھٹن اور خاموشی طاری تھی۔ بالکنیوں میں اور مکانوں کی کھڑکیوں کے پاس عورتیں ہاتھوں میں پھول لئے کھڑی تھیں اور ان کے نزدیک کھڑے ہوئے بچے، تہواری لباس میں ملبوس خود پھولوں کی مانند معلوم ہو رہے تھے۔

جس وقت ریل سیٹی بجاتی ہوئی اسٹیشن میں داخل ہوئی تو مجمع میں حرکت پیدا ہوئی اور کئی مسلے اور کچلے ہوئے ہیٹ کالی کالی چڑیوں کی طرح ہوا میں لڑنے لگے۔ موسیقاروں نے اپنے اپنے ساز سنبھالے اور چند سنجیدہ اور متین لوگ، اپنے لباس وغیرہ کو ذرا ٹھیک ٹھاک کر کے آگے بڑھے، مجمع کی طرف رخ کیا اور جوشیلے انداز میں دائیں بائیں اشارے کر کر کے کچھ بولنا شروع کر دیا۔

آہستہ آہستہ اور بھاری قدموں کے ساتھ مجمع بیچ میں جگہ چھوڑ کر ادھر ادھر ہو گیا اور سڑک تک ایک چوڑا سا راستہ بن گیا۔

"یہ لوگ کس سے ملنے آئے ہیں؟"

"پارما کے بچوں سے!"

پارما میں اسٹرائک ہو رہی تھی۔ مالک ذرا سا بھی جھکنے کو تیار نہیں تھے اور مزدوروں کی حالت اس قدر بری ہو چکی تھی کہ انہوں نے اپنے بچوں کو فاقوں سے بچانے کے لیے جینوآ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

اسٹیشن کی عمارت کے ستونوں کے پیچھے سے نیم برہنہ ننھے منے انسانوں کا ایک باترتیب جلوس نمودار ہوا، وہ اپنے تار تار لباسوں میں عجیب وغریب، جھبرے اور چھوٹے

چھوٹے جانوروں سے مشابہ تھے۔ وہ، ننھے منے، گرد آلود اور خستہ و ماندہ، پانچ پانچ کی قطار میں، ہاتھ میں ہاتھ دیئے چلے آرہے تھے ان کے چہرے گھمبیر تھے لیکن آنکھیں زندگی کی آب و تاب سے منور تھیں اور جب موسیقاروں نے ترانہ گیری بالڈی کی دھن چھیڑ دی تو ان دبلے سوکھے، فاقہ زدہ، ننھے ننھے چہروں پر خوشی کی مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔

مجمع نے ایک فلک شگاف نعرے کے ساتھ مستقبل کے ان مردوں اور عورتوں کا استقبال کیا، ان کے سامنے جھنڈے جھکائے گئے، پیتل کے بگل بجنے لگے، اور ان چیزوں نے بچوں کو کچھ چکا چوند اور مبہوت سا کر دیا۔ اس خیر مقدم سے کچھ حیران پریشان سے ہو کر وہ ایک لمحے کے لیے پیچھے ہٹے اور پھر یکبارگی وہ اس طرح سیدھے تن کر کھڑے ہو گئے کہ پہلے سے زیادہ لمبے معلوم ہونے لگے اور ایک دوسرے سے مٹ کر ایک واحد جسم میں تبدیل ہو گئے اور کئی سو گلوں سے ایک ہی آواز نکلی:

"ویوا اطالیہ*!"

"نوجوان پارما زندہ باد!" مجمع ان کی طرف دوڑتے ہوئے چلایا۔

"ایویوا گیری بالڈی**!" "بچے ایک بھورے بھورے گاؤ دم مثلث کی شکل میں مجمع کے اندر گھس کر اس میں غائب ہوتے ہوئے چلائے۔

ہوٹلوں کی کھڑکیوں میں سے اور مکانوں کی چھتوں پر سے رومال سفید پرندوں کی طرح ہوا میں اڑ رہے تھے اور وہاں سے لوگوں کے سروں پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی اور مسرور اور مگن آوازیں برس رہی تھیں۔

ہر چیز پر ایک تہواری رنگ چھا گیا۔ ہر چیز میں جان پڑ گئی، یہاں تک کہ مٹیالے سے رنگ کے سنگ مرمر میں بھی جا بجا کچھ خوش رنگ سے دھبے کھل اٹھے۔

فضا میں جھنڈے لہرائے، ٹوپیاں اور پھول اوپر اچھالے گئے، بچوں کے ننھے ننھے سر مجمع کے سروں سے اونچے اٹھے اور چھوٹے چھوٹے میلے کچیلے ہاتھ جو سلام کے

* اطالیہ زندہ باد! (ایڈیٹر)

** گیری بالڈی زندہ باد! (ایڈیٹر)

لیے پھیلے تھے، ہوا میں لہراتے ہوئے پھولوں کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگے اور فضا اس عظیم نعرۂ مسلسل سے گونجنے لگی:

"ویوا ال سوتسیالزمو*!"

"ایویوا اطالیہ!"

تقریباً سارے بچے ہاتھوں میں اٹھا لیے گئے تھے، بعض بڑے آدمیوں کے کاندھوں پر سوار تھے اور بعض سخت اور روکھے گل مچھوں والے مردوں کے چوڑے سینوں سے لگے ہوئے تھے۔ شور و شغب اور قہقہوں میں موسیقی کی آواز تقریباً بالکل دب گئی تھی۔

عورتیں مجمع میں ادھر سے ادھر دوڑ رہی تھیں، باقی ماندہ نو واردوں کو گود میں اٹھا رہی تھیں اور ایک دوسرے سے چلا چلا کر پوچھ رہی تھیں:

"انیتا، تم دو لو گی نا؟"

"ہاں۔ اور تم؟"

"ایک لنگڑی مارگریٹ کے لیے جانا نہ بھولنا......"

ایک پر مسرت جوش و ہیجان کا احساس ہر جگہ طاری و ساری تھا، ہر طرف خوشی سے کھلے ہوئے، مسکراتے چہرے اور محبت آمیز، پرنم آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں اور اسٹرائک کرنے والوں کے بعض بچوں نے ابھی سے روٹی کھانی شروع کر دی تھی۔

"ہمارے وقتوں میں کسی کو اس کا خیال نہیں آیا تھا!" ایک چونچیلی ناک والے بوڑھے نے، جو اپنے دانتوں کے بیچ میں ایک سیاہ سگار دبائے ہوئے تھا، اظہار خیال کیا۔

"اور ہے یہ کس قدر سادہ......"

"ہاں! سادہ اور معقول۔"

بوڑھے نے اپنے منہ میں سے سگار نکالا، اس کے سرے پر ایک نظر ڈالی اور

* سوشلزم زندہ باد! (ایڈیٹر)

راکھ جھاڑتے ہوئے اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ پھر اپنے قریب دو پارما کے بچوں کو، جو قرائن سے بھائی معلوم ہوتے تھے، دیکھ کر اس نے اپنے چہرے پر ایک خوفناک رنگ پیدا کر لیا...... دونوں بھائی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہے تھے...... اپنی ٹوپی آنکھوں پر سرکا لی، اپنے دونوں بازو پھیلا لیے اور جب دونوں بھائی تیوری پر بل ڈال کر ایک ساتھ پیچھے ہٹے تو یکبارگی وہ پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا اور مرغے کی طرح ککڑوں کوں، ککڑوں کوں کرنے لگا۔ بچے اپنے ننگے پاؤں کے تلوے پتھر کے فرش پر مار مار کر بے تحاشہ قہقہے لگانے لگے۔ وہ آدمی اٹھا، اپنی ٹوپی درست کی اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔ وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔

ایک سفید بالوں والی کبڑی عورت، جس کا چہرہ ایک جادوگرنی کا سا تھا اور جس کی ہڈیالی ٹھوڑی پر سخت سخت، سفید بال اگے ہوئے تھے، کولمبس کے مجسمے کے پاؤں کے قریب کھڑی رو رہی تھی اور اپنی لال آنکھوں کو اپنی بدرنگ چادر کے کنارے سے پونچھ رہی تھی...... وہ کالی اور بدصورت عورت اس پر جوش مجمع کے بیچ میں بالکل یکہ و تنہا سی لگ رہی تھی۔

اک سیاہ بالوں والی نوجوان جینوآئی عورت سبک قدموں سے چلتی ہوئی آئی۔ وہ ایک تقریباً سات سالہ لڑکے کو انگلی پکڑ کے ساتھ لا رہی تھی جس نے پاؤں میں کھڑاویں پہن رکھی تھیں اور سر پر ایک بھورے رنگ کا اتنا لمبا چوڑا ہیٹ اوڑھے ہوئے تھا جو تقریباً اس کے شانوں تک پہنچ رہا تھا۔ وہ بار بار ہیٹ کو اپنی آنکھوں کے اوپر سے ہٹانے کے لیے اپنے ننھے سے سر کو جھٹکے دے رہا تھا لیکن وہ برابر پھسل کر اس کے چہرے پر آئے جا رہا تھا۔ آخرکار اس عورت نے ہنستے اور گاتے ہوئے اسے ہٹا کر ہوا میں اچھال دیا اور بچے نے، جس کے چہرے پر تبسم کی کلیاں کھلی جا رہی تھیں، اسے دیکھنے کے لیے سر کو پیچھے ڈالا اور پھر اسے پکڑنے کے لیے کودا اور اسی وقت وہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ایک لمبا تڑنگا آدمی جس نے چمڑے کا پیش بند پہن رکھا تھا، ایک چھ سالہ بچی

کو اپنے کندھے پر بٹھائے لئے جا رہا تھا، وہ ایک ننھی منی بھوری چوہیا جیسی تھی۔

"تم سمجھیں میرا کیا مطلب ہے؟" اس نے ایک عورت سے کہا جو اس کے ساتھ ساتھ ایک آتشی سرخ رنگ کے بالوں والی چھوٹے سے لڑکے کا ہاتھ پکڑے ہوئے چل رہی تھی۔ "اگر اس قسم کی چیز جڑ پکڑ لے.....تو ہم لوگوں کو ہرانا آسان نہیں ہوگا، ہے نا؟"

اور ایک گہری اور بلند فاتحانہ ہنسی کے ساتھ اس نے اپنے ننھے منے بوجھ کو نیلی فضا میں اچھال دیا اور چلایا:

"ایو یوا پار ما۔آ!"*

رفتہ رفتہ مجمع چھٹ گیا اور لوگ بچوں کو گود میں لئے یا ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے ادھر ادھر چلے گئے اور چوک میں سوائے مسلے ہوئے پھولوں، مٹھائیوں کے کاغذوں اور خوش باش گاڑی بانوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ یا پھر ان سب کے اوپر اس آدمی کا شاندار پیکر تھا جس نے نئی دنیا کی دریافت کی۔

اور ایک نئی زندگی کی طرف جاتے ہوئے لوگوں کی پرمسرت چیخیں سڑکوں پر بڑے بڑے بگل باجوں کی آواز کی طرح گونج رہی تھیں۔

میکسم گورکی

پرعزم بوڑھا

ایک کھوکھلی سی خاموشی کے درمیان سورج طلوع ہوتا ہے اور سنہری پھولوں کی میٹھی میٹھی خوشبو سے بوجھل، نیلگوں کہرا پتھریلے جزیرے سے آسمان کی جانب تیرنے لگتا ہے۔

خوابیدہ سمندر کی تاریک سی وسعتوں کے بیچ میں اور آسمان کے پیلے پیلے قبے کے نیچے یہ جزیرہ سورج دیوتا کی پوجا کے لیے ایک عبادت گاہ معلوم ہوتا ہے۔

تارے ابھی ابھی ٹمٹما کر نظروں سے اوجھل ہوئے ہیں لیکن سفید زہرہ ابھی تک پھولے پھولے بادلوں کے ایک نرم و نازک سے کنارے کے کچھ ہی اوپر دھندلے دھندلے آسمان کی ٹھنڈی وسعتوں میں واحد اور تنہا تابندہ اور درخشاں ہے۔ بادلوں میں گلابی رنگ کے ہلکی سی آمیزش ہے اور وہ سورج کی پہلی کرن کی روشنی میں ہلکے ہلکے چمک اٹھے ہیں اور سمندر کے ساکن سینے پر ان کا عکس سمندر کی نیلگوں گہرائیوں سے نکل کر سطح پر آئے ہوئے سچے موتی کی مانند معلوم ہو رہا ہے۔

نقرئی شبنم سے لدی ہوئی پھولوں کی پنکھڑیاں اور گھاس کی پتیاں سورج کی طرف منہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ گھاس کی پتیوں کے سروں پر معلق شبنم کی چمکیلی بوندیں بڑی ہوتے ہوتے آخر کار زمین پر گر پڑتی ہیں، جیسے نیند میں پسینہ آیا ہوا ہے۔ ان قطروں کے زمین پر گرنے کی نرم نرم کھنک سننے کا اشتیاق ہوتا ہے اور جب اسے نہیں سن

پاتے تو افسوس ہوتا ہے۔

پرندے جاگ گئے ہیں اور زیتون کے پتوں کے درمیان ادھر سے ادھر اڑ رہے ہیں اور اپنا ترانہ صبح گا رہے ہیں۔ نیچے سے سمندر کے گہرے گہرے سانسوں کی آواز آ رہی ہے جسے سورج نے جگا دیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود ابھی تک خاموشی ہے کیونکہ لوگ ابھی سوئے پڑے ہیں۔ صبح سویرے کی تازہ فضا میں گھاس اور پھولوں کی نکہت آواز سے زیادہ تیز ہے۔

بوڑھا اتورے سیکو سورج کے سواگت کے لیے نکل کر ایک چھوٹے سے سفید گھر کے دروازے پر آتا ہے، وہ گھر انگور کی بیلوں سے اس طور پر ڈھکا ہوا ہے کہ سبز موجوں میں گھری ہوئی چھوٹی سی کشتی سے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ سیکو ایک پستہ قد بوڑھا ہے جس کے نہ کوئی آگے ہے نہ پیچھے۔ اس کے لمبے لمبے بازو بندروں کے سے ہیں اور اس کی ننگی کھوپڑی ایک مردِ دانا کی سی، اس کے چہرے پر زمانے کے دستبرد نے اتنی بے شمار شکنیں ڈال دی ہیں کہ اس کی آنکھیں تقریباً پوری طرح اس کی جھریوں دار کھال میں چھپ گئی ہیں۔

اپنا بالوں والا سانولا ہاتھ آہستہ آہستہ اپنی پیشانی کی طرف لے جاتے ہوئے وہ گلابی آسمان پر ایک نظر ڈالتا ہے اور اپنے گرد و پیش کے منظر کو دیکھتا ہے: اس کے سامنے چٹانوں کے خاکستری مائل ارغوانی رنگ کے پس منظر میں شگوفوں اور غنچوں کے زمردیں، سنہری، گلابی، زرد اور لال رنگوں کا ایک وافر خزانہ بکھرا ہوا ہے۔ اس کا سانولا چہرہ ایک نرم نرم مسکراہٹ سے مرتعش سا ہو جاتا ہے اور وہ پسندیدگی سے اپنا بھاری اور گول سر ہلاتا ہے۔

وہ ایسے کھڑا ہے جیسے کوئی بھاری بوجھ لیے ہوئے ہو، اس کی کمر کچھ جھکی ہوئی ہے اور اس کی دونوں ٹانگیں ایک دوسرے سے دور دور ہیں۔ اور اس کے چاروں طرف تابندہ اور مسرور، نوخیز دن اٹکھیلیاں کر رہا ہے، انگور کی بیلوں کا سبز رنگ اور زیادہ تیز اور شوخ ہو گیا ہے، ننھی سنہری چڑیوں کے چہچہے اور زیادہ بلند ہو گئے ہیں......بٹیریں

بلیک بیری کی اور دودھیا رس والی جھاڑیوں کے درمیان پھدک رہی ہیں اور کہیں ایک نیپلس والوں کی سی بانکی البلبلی اور بے فکری بلیک برڈ نے مزے مزے سے کوئی ہلکی پھلکی دھن چھیڑ دی ہے۔

بوڑھا سیکو اپنے لمبے تھکے ہوئے بازوؤں کو اپنے سر سے اوپر لے جاتا ہے اور اس طرح انگڑائی لیتا ہے جیسے ساغر میں رکھی ہوئی شراب کی مانند پرسکون سمندر میں غوطہ لگانے کے لیے تیار ہو رہا ہو۔

انگڑائی لے کر اپنی بوڑھی ہڈیوں کو آرام دینے کے بعد وہ دروازے کے پاس ایک پتھر پر بیٹھ جاتا ہے، اپنی صدری کی جیب سے ایک پوسٹ کارڈ نکالتا ہے اور اسے اپنے سے دور کر کے بہت دیر تک آنکھیں سکیڑے اس پر نظر جمائے رہتا ہے اور اس کے ہونٹ بغیر آواز نکالے ہلتے رہتے ہیں۔ اس کا بڑا سا اور بہت دن سے استرے سے نا آشنا چہرہ، جس پر گویا چاندی کے تار اگے ہوئے ہیں، ایک نئی مسکراہٹ سے دمک اٹھتا ہے...... ایک ایسی مسکراہٹ جس میں محبت، فخر اور غم کی ایک عجیب وغریب آمیزش ہے۔

اس کے سامنے ایک دفتی کے ٹکڑے کے اوپر چپکے ہوئے کاغذ پر نیلی روشنائی میں دو ہٹے کٹے، تندرست لڑکوں کی ایک ڈرائنگ بنی ہوئی ہے جو پہلو بہ پہلو بیٹھے بشاشت سے مسکرا رہے ہیں، بوڑھے سیکو کی طرح ان دونو جوانوں کے سر بڑے بڑے اور بال گھونگریالے ہیں۔ کارڈ کے اوپر بڑے بڑے اور روشن حروف میں چھپا ہوا ہے:

''آرتورو سیکو اور ایزیکو سیکو، اپنے طبقے کے مفاد کے عالی ظرف علم بردار۔ انہوں نے کپڑے کی ملوں کے ۲۵۰۰۰ مزدوروں کو، جو ہفتے میں چھ ڈالر کماتے تھے، منظم کیا اور اس کی سزا میں انہیں جیل ڈال دیا گیا۔

''سماجی انصاف کے مجاہد، زندہ باد!''

بوڑھا سیکو پڑھنا نہیں جانتا، اس کے علاوہ اس ڈرائنگ کے اوپر کسی بدیشی زبان میں لکھا ہوا ہے لیکن اسے معلوم ہے کہ اس میں کیا لکھا ہے، اس کا ایک ایک لفظ اس کے لیے جانا پہچانا ہے، ہر ہر لفظ ایک بگل کی بانگ کی طرح ہے۔

یہ نیلا پوسٹ کارڈ اس بوڑھے کے لیے بہت فکر اور پریشانی لے کر آیا ہے۔ دو مہینے ہوئے اسے یہ کارڈ ملا تھا اور اس کے دل نے جو باپ کا دل تھا اسے فوراً بتا دیا کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہے: غریب آدمیوں کی تصویریں تو اسی وقت چھپتی ہیں جب وہ قانون توڑتے ہیں۔

سیکو نے اس کاغذ کو اپنے جیب میں رکھ لیا لیکن وہ اس کے دل پر رکھے ہوئے بوجھ کی طرح تھا اور یہ بوجھ روز بروز زیادہ وزنی ہوتا رہا۔ اس نے کئی دفعہ اسے پادری کو دکھانے کا ارادہ کیا لیکن طویل تجربے نے اسے سکھا دیا تھا کہ لوگ صحیح ہی کہتے ہیں: ''پادری ممکن ہے خدا سے انسان کے متعلق سچی بات کہہ دے لیکن انسان سے کبھی سچی بات نہیں کہتا ہے!''

پہلا آدمی جس سے اس نے اس پوسٹ کارڈ کی پراسرار اہمیت واضح کرنے کے لیے کہا ایک لال بالوں والا فنکار تھا، وہ ایک لمبا دبلا بدیشی آدمی تھا جو اکثر سیکو کے گھر آیا کرتا تھا اور پھر اس کے قریب سونے کو لیٹ جاتا تھا اور اس کا سر نامکمل تصویر کی مربع پرچھائیں میں چھپ جاتا تھا۔

''سینیور'' سیکو نے اس سے پوچھا ''ان لوگوں نے کیا کیا ہے؟''

فنکار نے بوڑھے کے بیٹوں کے مسکراتے ہوئے چہروں کو دیکھا اور کہا: ''غالباً کوئی مزے دار حرکت ہی کی ہوگی۔''

''لیکن یہاں ان کے متعلق لکھا کیا ہے؟''

''یہ انگریزی زبان میں لکھا ہے۔ انگریزوں کے علاوہ ان کی زبان اور کوئی نہیں سمجھتا اور ہاں اس کے سوا خدا اور اگر میری بیوی اس سلسلے میں جھوٹ نہیں بولتی، جیسا کہ وہ زیادہ تر صورتوں میں بولتی ہے، تو وہ بھی سمجھتی ہے......''

فنکار بے حد باتونی تھا، یہ بات صاف تھی کہ وہ کسی بھی موضوع پر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کا اہل نہیں تھا، چنانچہ بوڑھا متنفر ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ اگلے دن وہ فربہ اندام سینیورا...... فنکار کی بیوی...... کے پاس گیا۔ وہ باغ میں تھی۔ کسی سفید اور بالکل

مہین کپڑے کا ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہنے ہوئے وہ ایک جھولنا کھٹولے پر لیٹی گرمی میں پگھلی سی جارہی تھی اور اس کی نیلی آنکھیں خفگی سے نیلے آسمان کو تک رہی تھیں۔

"ان لوگوں کو جیل بھیج دیا گیا ہے۔" اس نے ٹوٹی پھوٹی اطالوی میں کہا۔

اس کی ٹانگیں اس طرح کانپنے لگیں جیسے جزیرے میں زلزلہ آگیا ہو۔ مگر اس کے باوجود اس نے کسی نہ کسی طرح یہ پوچھنے کی طاقت مجتمع کر لی:

"کیا انہوں نے چوری کی ہے یا کسی کو قتل کیا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ صرف یہ بات ہے کہ یہ لوگ سوشلسٹ ہیں۔"

"سوشلس ہے، بوڑھے!" سینیورا نے ایک ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

سیکو جانتا تھا کہ بدیشی لوگ بہت بے وقوف ہوتے ہیں، کالا برینوں سے بھی زیادہ بے وقوف۔ مگر وہ اپنے بچوں کے متعلق ٹھیک بات جاننا چاہتا تھا اس لیے وہ بہت دیر تک سینیورا کے پاس کھڑا رہا اور اس کا انتظار کرتا رہا کہ وہ اپنی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں کھولے۔ اور جب آخر کار اس نے آنکھیں کھولیں تو بوڑھے نے اپنی انگلی سے کارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

"کیا اس میں سچی بات لکھی ہے؟"

"میں نہیں جانتی" اس نے ناگواری سے جواب دیا' میں تم سے کہہ چکی ہوں یہ سیاست ہے۔ تم سمجھتے نہیں ہو؟"

نہیں، وہ نہیں سمجھتا تھا۔ سیاست تو وہ چیز تھی جسے روم میں وزیر اور امیر لوگ غریبوں سے اور زیادہ ٹیکس وصول کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لیکن اس کے بیٹے تو مزدور تھے، وہ امریکہ میں رہتے تھے اور بڑے اچھے لڑکے تھے۔ انہیں بھلا سیاست سے کیا سروکار تھا؟

رات بھر وہ اپنے بیٹوں کی تصویریں اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا...... چاندنی میں وہ بہت تاریک تاریک سے معلوم ہو رہے تھے اور بوڑھے کے خیالات اور بھی زیادہ

تاریک ہوتے گئے۔ صبح کو اس نے پادری سے پوچھنے کا فیصلہ کرلیا۔ سیاہ چغے میں ملبوس پادری نے رکھائی سے کہا:

''سوشلسٹ وہ لوگ ہیں جو خدا کی مشیت کے منکر ہیں۔ یہ تمہارے لیے کافی ہونا چاہیے۔''

اور جب بوڑھا جانے کے لیے مڑا تو اس نے اور بھی زیادہ سختی سے کہا:

''تمہیں اس عمر میں ایسی باتوں سے واسطہ رکھتے شرم آنی چاہیے!''

''اچھا ہی ہوا میں نے اسے تصویریں نہیں دکھائیں۔'' سیکو نے سوچا۔

چند دن اور گزر گئے۔ تب بوڑھا حجام کے پاس گیا جو ایک بے دماغ کا چھیلا تھا اور کسی نوعمر خچر کی طرح مضبوط اور توانا۔ اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ پیسہ لے کر ان حسین امریکی عورتوں سے عشق بازی کرتا تھا جو بظاہر حسین مناظر سے لطف اندوز ہونے لیکن دراصل غریب نوجوانوں کے ساتھ داد عیش دینے اس جزیرے میں آتی تھیں۔

''اوہ خدا!'' جب اس بدمعاش آدمی نے اس کارڈ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھی تو اس کے گال خوشی سے تمتمانے لگے اور وہ چیخ پڑا'' آرتورو اور ایزیکو، میرے ساتھی! اوہ، بابا اتورے، میں تمہیں دلی مبارکباد دیتا ہوں، تمہیں بھی اور خود کو بھی! اب میرے دو اور مشہور ہم وطن ہو گئے۔ کیا یہ قابل فخر بات نہیں ہے؟''

''اپنی اس احمقانہ بکواس کو بند کرو!'' بوڑھے نے اسے تنبیہ کی۔

لیکن حجام اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر چلایا ''شاندار!''

''ان کے متعلق کیا لکھا ہے یہاں؟'' بوڑھے نے اصرار سے پوچھا۔

''اس میں جو کچھ لکھا ہے اسے میں پڑھ تو نہیں سکتا لیکن مجھے یقین ہے کہ سچی ہی بات لکھی ہوگی۔ اگر غریب آدمیوں کے متعلق سچی بات کہی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ بہت بڑے ہیرو ہی ہوں گے!''

''خدا کے واسطے اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔'' سیکو نے کہا اور پتھروں پر اپنے

چوبی جوتے کھڑکھڑاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

وہ روسی سینیور کے پاس گیا جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ نیک دل اور ایمان دار آدمی ہے۔ وہ اندر آیا اور اس پلنگ کے پاس، جس پر سینیور پڑا ہوا آخری سانس لے رہا تھا، بیٹھ گیا اور اس سے پوچھا:

''ان دونوں آدمیوں کے متعلق یہاں کیا لکھا ہے؟''

روسی نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر، جو بیماری کی وجہ سے بے رونق اور غمگین ہو گئی تھیں، نقاہت بھری آواز میں پوسٹ کارڈ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھی اور ایک گرمجوشی کی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کو منور کر دیا۔

''سینیور'' بوڑھے نے اس سے کہا' آپ دیکھتے ہیں کہ میں بہت بوڑھا ہوں اور جلد ہی میں اپنے خالق کے پاس چلا جاؤں گا۔ جب کنواری مریم مجھ سے پوچھیں گی کہ میں نے اپنے بچوں کے ساتھ کیا کیا ہے وہ مجھے ساری باتیں سچ سچ بتانی ہوں گی۔ یہ میرے بچے ہیں لیکن مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا کیا ہے اور انہیں جیل کیوں بھیجا گیا ہے؟''

''تم کنواری مریم سے کہہ سکتے ہو'' روسی نے پر خلوص سنجیدگی سے اسے مشورہ دیا'' کہ تمہارے بچوں نے مقدس مریم کے بیٹے کے سب سے اہم فرمان کو بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا: وہ اپنے پڑوسیوں سے واقعی محبت کرتے تھے......''

بوڑھے کو روسی کا یقین آ گیا کیونکہ جھوٹ کبھی سیدھی سادی زبان میں نہیں ادا کیا جا سکتا، جھوٹ کے لیے تو خوبصورت الفاظ اور مرصع فقروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس نے بیمار آدمی کے چھوٹے سے نرم نرم ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے مصافحہ کیا۔

''تو ان کے لیے جیل میں ہونا کوئی شرم کی بات نہیں ہے؟''

''نہیں'' روسی نے کہا ''تم جانتے ہو کہ امیر لوگ اسی وقت جیل بھیجے جاتے ہیں جب وہ اس قدر بری حرکتیں کرتے ہیں کہ انہیں چھپانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور

غریب آدمی جوں ہی ذرا سی اچھی بات کی تمنا کرنے لگتے ہیں فوراً نہیں قید کرلیا جاتا ہے۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ تم خوش قسمت باپ ہو!''

اور وہ بہت دیر تک سیکو سے باتیں کرتا رہا۔ وہ اسے اپنی کمزور آواز میں بتاتا رہا کہ اس دنیا میں ایمان دار آدمی غربت اور بے وقوفی کو ختم کرنے اور ان تمام برائیوں اور قابل نفرت باتوں پر فتح پانے کے لیے، جو غربت اور بے وقوفی سے پیدا ہوتی ہیں، کیا کررہے ہیں......

سورج آسمان پر ایک شعلہ ساماں پھول کی طرح سوزاں اور درخشاں ہے، وہ اپنی کرنوں کا طلائی برادہ بھوری چٹانوں پر برسا رہا ہے، اور پتھروں کی ہر ہر درز سے زندگی مشتاقانہ سورج کی سمت پہنچنا چاہ رہی ہے.....سبز گھاس اور آسمانی رنگ کے پھول۔ دھوپ کی سنہری چنگاریاں ایک دم بھڑکتی ہیں اور پھر بلوریں شبنم کے پھولے ہوئے قطروں کے اندر پہنچ کر بجھ جاتی ہیں۔

اور بوڑھا اپنے گردوپیش کی ہر زندہ چیز کو غور سے دیکھتا ہے اور زندگی بخش دھوپ کو پیاسوں کی طرح پی رہا ہے اور جب وہ اپنے گھونسلے بنانے میں مصروف پرندوں کے گیت سنتا ہے تو اسے اپنے بیٹوں کا خیال آتا ہے، اپنے ان لڑکوں کا جو سمندر پار ایک بڑے شہر میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھے ہیں اور اسے خیال آتا ہے کہ ان بیچارے لڑکوں کی صحت کے لیے جیل میں بند ہونا کتنا برا ہے......

لیکن تب اسے خیال آتا ہے کہ وہ جیل میں اس لیے ہیں کہ وہ ایمان دار نوجوان ہیں، جیسا کہ ان کا باپ تمام عمر رہا ہے...... اور وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور اس کا تمتمایا ہوا چہرہ ایک پر فخر تبسم سے کھل اٹھتا ہے۔

''دھرتی مالا مال ہے، انسان غریب ہیں، سورج مہربان ہے، انسان کے لئے رحم ہے۔ میں نے زندگی بھر ان چیزوں کے بارے میں سوچا ہے اور اگرچہ میں نے ان سے یہ سب باتیں نہیں کی ہیں لیکن وہ اپنے باپ کے خیالات کو سمجھ گئے ہیں۔ ہفتے میں چھ ڈالر، اس کا مطلب ہے چالیس لیرے۔ اوہو! لیکن انہوں نے اسے بھی کم سمجھا اور

انہیں کی طرح کے پچیس ہزار اور آدمیوں نے بھی یہی سمجھا...... یہ ان لوگوں کے لیے بہت کم ہے جو اچھی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں......"

اسے یقین ہے کہ جن خیالات کو اس نے اپنے سینے سے لگا کر رکھا تھا انہیں اس کے بچوں نے پروان چڑھایا ہے اور وہ اس بات پر بہت فخر کرتا ہے لیکن چونکہ وہ جانتا ہے کہ انسان ان طلسماتی داستانوں پر بہت کم ہی یقین کرتے ہیں جن کا تانا بانا وہ ہر روز خود ہی بنتے رہتے ہیں اس لیے وہ اپنے خیالات کو اپنے ہی تک رکھتا ہے۔

لیکن بعض اوقات اس کا بوڑھا اور بڑا دل اپنے بچوں کے مستقبل کے خیالوں سے بھر جاتا ہے۔ اور اس وقت وہ اپنی تھکی ہوئی کمر کو سیدھا کر لیتا ہے، گہرا سانس لیتا ہے اور اپنی دم توڑتی ہوئی ہمت کو مجتمع کر کے بھرائی ہوئی سی آواز میں سمندر کی طرف منہ کر کے، جدھر اس کے بچے ہیں، چلاتا ہے:

"وا...... آ...... لو!......"*

اور سورج گہرے سمندر کے اوپر، بلند سے بلند تر ہوتا جاتا ہے اور ہنستا ہے اور اوپر انگور کے باغوں سے لوگ بوڑھے کی پکار کو دھراتے ہیں:

"...... و...... وا!......"

میکسم گورکی

مقابلہ

سان گیا کو موحلہ اپنے فوارے پر بجا طور پر نازاں ہے۔ لافانی گیووانی بوکاچو اس کے قریب ٹھیر کر گرما گرم مباحثے اور مناظرے کرنے کا بہت شوقین تھا اور ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ عظیم سالواتر روزا نے اسے اپنی بہت بڑی بڑی تصویروں میں شامل کیا ہے۔ سالواتر روزا، تو ماسوانی ایلو کا دوست تھا جسے غریب آدمی جن کی آزادی کی خاطر اس نے جدوجہد کی اور جان دی، مازانیئلو کہتے تھے۔ مازانیئلو بھی ہمارے محلے میں پیدا ہوا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ یہاں بہت سے مشہور آدمی پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے۔ پرانے وقتوں میں آج کل کی نسبت زیادہ بڑے آدمی پیدا ہوتے تھے اور وہ زیادہ نمایاں بھی ہوتے تھے۔ آج کل جب کہ ہر کس و ناکس کوٹ پہنے پھرتا ہے اور سیاست کے میدان میں اتر پڑتا ہے اپنے ساتھیوں سے اونچا اٹھنا خاصا مشکل کام ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ اس صورت میں روح کا ارتقاء نہیں ہوسکتا جبکہ وہ اخباروں میں لپٹی ہوئی ہو۔

پچھلی گرمیوں تک تونیسا بھی ہمارے محلے کی جان تھی۔ وہ کنجڑن تھی اور ہمارے محلے کی سب سے حسین عورت تھی جہاں سورج ہمیشہ شہر کے دوسرے حصوں سے کچھ زیادہ دیر تک رہتا ہے اور وہ دنیا کی سب سے زیادہ مسرور انسان تھی۔ فوارہ ظاہر ہے ابھی تک وہیں ہے جہاں ہمیشہ سے تھا، فقط وہ پرانا ہوتے ہوتے پیلا پڑ گیا ہے اور بہت دن تک بدیشی لوگوں کو اپنے مضحک حسن سے محظوظ کرتا رہے گا کیونکہ سنگ مرمر

کے بچے کبھی بوڑھے نہیں ہوتے اور کبھی کھیلتے کھیلتے تھکتے نہیں ہیں۔

لیکن پچھلی گرمیوں میں رسیلی نونسیا مرگئی۔ وہ سڑک پر ناچتے ناچتے ختم ہوگئی اور چونکہ عام طور پر لوگ اس طرح نہیں مرتے ہیں اس لیے اس کی کہانی سننے اور سنانے کے لائق ہے۔

وہ اتنی زیادہ زندہ دل، خوش باش اور گرم جوش قسم کی عورت تھی کہ کسی بھی طرح کے شوہر کے ساتھ سکون سے نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے شوہر نے بہت عرصے تک اس بات کو نہیں سمجھا...... وہ چیختا تھا، گالی گلوچ کرتا تھا، اپنے ہاتھ ہلاتا تھا اور لوگوں کو چاقو دکھا کر ڈراتا تھا اور ایک دن اس نے اپنا چاقو کسی کے پہلو میں گھسا ہی دیا۔ لیکن پولیس کو ایسے مذاق پسند نہیں ہیں لہٰذا اسٹیفانو اپنی سزا کی مدت قید خانے میں گذارنے کے بعد آرجینٹینا چلا گیا: گرم مزاج لوگوں کے لیے تبدیل آب و ہوا مفید ثابت ہوتی ہے۔

سوتئیس سال کی عمر میں نونسیا تقریباً بیوہ ہوگئی اور اس کے پاس ایک پانچ سالہ بچی، ایک خچروں کی جوڑی، ایک ترکاریوں کا باغ اور ایک چھوٹی سی گاڑی کے سواء اور کچھ نہیں تھا، لیکن چونکہ ایک خوش دل آدمی کو زیادہ مال ومتاع کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے یہی کچھ اس کے لیے بہت کافی تھا۔ وہ کام کرنا جانتی تھی اور ہمیشہ بہت سے لوگ اس کی مدد کرنے کے لیے خوشی سے تیار رہتے تھے اور جب وہ ان کی محنت کا معاوضہ پیسوں سے نہیں دے سکتی تھی تو وہ اپنی ہنسی سے، اپنی گیتوں سے اور ان تمام بیش قیمت چیزوں سے جو روپے پیسے سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہیں ان کی اجرت ادا کر دیتی تھی۔

سب عورتیں اس کے طور طریقوں کو پسند نہیں کرتی تھیں اور ظاہر ہے سارے مرد بھی اس کے طرز زندگی سے خوش نہیں تھے لیکن چونکہ وہ بنیادی طور پر ایک ایمان دار عورت تھی اس لیے وہ شادی شدہ مردوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتی تھی اور یہی نہیں بلکہ وہ اکثر ان میں اور ان کی بیویوں میں صلح صفائی بھی کرادیتی تھی۔

”جو آدمی کسی عورت سے محبت کرنا چھوڑ دیتا ہے اس نے دراصل کبھی محبت کی ہی نہیں ہے......“ وہ کہا کرتی تھی۔

آرتورولانو ایک مچھیرا تھا جس نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں ایک دینیات کے مدرسے میں تعلیم پائی تھی اور اسے پادری بننے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا لیکن بہت عرصے سے اس نے راہ خیر کو خیر باد کہہ دیا تھا اور وہ سمندر اور شراب خانے اور اسی قسم کے دوسرے خوشگوار مقامات میں غرق ہو چکا تھا۔ یہ لانو جو بے شرمی کے گیت بنانے میں ماہر تھا ایک دفعہ نونسیا سے کہنے لگا:

''تمہارا تو یہی خیال ہے کہ محبت دینیات کا سا پیچیدہ علم ہے؟''

''میں علم وغیرہ کے بارے میں تو کچھ جانتی وانتی نہیں۔'' اس نے جواب دیا ''لیکن میں تمہارے سارے گانے جانتی ہوں۔'' اور اس نے آرتورو کو، جو پیپے کی طرح موٹا تھا، یہ گیت گا کر سنایا:

ایسا ہوتا ہی آیا ہے
یہ کوئی نئی بات نہیں ہے
کنواری مریم نے بھی آغاز بہار ہی میں
اپنے بیٹے کو جنم دیا تھا۔

ظاہر ہے وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا اور اس کی چھوٹی چھوٹی ذہین آنکھیں اس کے موٹے موٹے سرخ گالوں کی تہوں میں چھپ گئیں۔

اور اس طرح وہ رہتی سہتی رہی...... خود خوش دل اور مسرور، بہت سے لوگوں کے لیے باعث مسرت اور سب کے لیے خوش گوار، کیونکہ وقت گزرنے پر اس کی سہیلیوں نے بھی اسے معاف کر دیا، انہوں نے سمجھ لیا کہ آدمی اپنے کردار کو بدل نہیں سکتا اور انہیں یاد آ گیا کہ بڑے بڑے اولیاء بھی ہمیشہ اپنی سیرت پر فتح پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اور پھر مرد کوئی خدا تھوڑا ہی ہے اور ہمیں صرف خدا ہی کے ساتھ وفادار ہونا چاہیے۔

کوئی دس سال تک نونسیا تارے کی طرح چمکتی رہی، اسے متفقہ طور پر محلے کی حسین ترین عورت اور بہترین رقاصہ مان لیا گیا تھا اور اگر وہ دوشیزہ ہوتی تو اسے یقیناً

ملکہ بازار بھی چن لیا گیا ہوتا کیونکہ دراصل تو سب کی نظروں میں وہی ملکہ بازار تھی۔
یہاں تک کہ بدیشی لوگوں کی توجہ بھی اس کی طرف مبذول کرائی جاتی تھی اور یقیناً وہ اس سے خلوت میں بات کرنے کے لیے بہت کچھ دینے کو تیار ہو سکتے تھے لیکن اس چیز پر وہ ہمیشہ خوب دل کھول کر ہنستی تھی۔

''وہ نچڑے لیموں کا سا سینیور مجھ سے کس زبان میں بات کرے گا؟''

''سنہری سکوں کی زبان میں، احمق لڑکی۔'' معزز لوگ اسے یقین دلاتے تھے۔ لیکن وہ جواب دیتی تھی:

''اجنبیوں کے ہاتھ بیچنے کے لیے میرے پاس پیاز، لہسن اور ٹماٹر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے......''

بعض دفعہ اس کے سچے خیر خواہ خلوص سے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔

''نونسیا بس ایک آدھ مہینے کی بات ہے تو بہت دولت مند ہو سکتی ہو! اچھی طرح سوچ لو اور یہ یاد رکھو کہ تمہارے ایک لڑکی بھی ہے۔''

''نہیں'' وہ مضبوطی سے جواب دیتی تھی۔ ''مجھے اپنے جسم سے اتنی محبت ہے کہ میں اس کی توہین نہیں کر سکتی۔ میں جانتی ہوں کہ ایک دفعہ کوئی کام خلاف مرضی کر لیا جائے تو ہمیشہ کے لیے اپنی خودداری سے ہات دھونا پڑتا ہے۔''

''لیکن تم دوسروں سے تو انکار نہیں کرتیں؟''

''نہیں، اپنی قسم کے لوگوں سے اور جب چاہتی ہوں تب انکار نہیں کرتی۔''

''اپنی قسم کے لوگوں سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''جن لوگوں کے درمیان میں پلی بڑھی ہوں اور جو مجھے اچھی طرح سمجھتے ہیں۔'' وہ تڑسے جواب دیتی تھی۔

لیکن اس کے باوجود ایک بدیشی کے ساتھ اس کا معاشقہ ضرور چلا تھا۔ وہ انگلستان کا رہنے والا تھا اور پیشہ کے لحاظ سے محافظ جنگلات۔ وہ ایک عجیب سا انسان تھا۔ بہت خاموش طبیعت، حالانکہ وہ ہماری زبان بول لیتا تھا۔ وہ جوان تھا لیکن اس کے

بال سفید ہو چلے تھے اور اس کے چہرے پر ایک زخم کا نشان تھا۔ اس کا چہرہ قاتل کا سا تھا اور آنکھیں ولی کی سی۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ کتابیں لکھتا تھا اور بعض لوگوں کا بیان تھا کہ وہ جواری ہے۔ اس نے یہاں تک کیا کہ اس کے ساتھ سسلی چلی گئی اور جب واپس آئی تو بہت دبلی اور تھکی تھکی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن وہ یقیناً مال دار نہیں تھا کیونکہ نونسیا اپنے ساتھ نہ روپیہ پیسہ لے کر آئی اور نہ ہی تحفے تحائف اور وہ پھر ہم لوگوں کے ساتھ رہنے لگی۔ ہمیشہ کی طرح چونچال، خوش باش اور مشتاق مسرت۔

لیکن ایک دن...... وہ کوئی تہوار کا دن تھا۔ جب لوگ گرجے سے باہر آرہے تھے کسی نے تعجب سے کہا:

"ارے دیکھو ذرا! نینا تو ہو بہو اپنی ماں کی تصویر بن گئی ہے!"

اور یہ واقعی سچ بات تھی، ماہ مائی کے ایک روز روشن کی طرح صاف اور عیاں۔ نونسیا کی ننھی لڑکی غنچہ ناشگفتہ سے کھلا ہوا پھول بن گئی تھی اور اپنی ماں ہی کی طرح تابندہ تازہ معلوم ہونے لگی تھی۔ وہ ابھی صرف چودہ ہی سال کی تھی لیکن خوب دراز قد تھی اور اپنے گھنے اور چمکیلے بالوں اور مغرور آنکھوں کی وجہ وہ اپنی عمر سے زیادہ معلوم ہوتی تھی اور بلوغ میں قدم رکھنے کے لیے بالکل پکی پکائی، تیار۔

نونسیا خود اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"اوہ مقدس مریم! نینا کیا تم مجھ سے زیادہ خوبصورت ہونا چاہتی ہو؟"

لڑکی مسکرائی۔ "نہیں" اس نے جواب دیا "تمہاری جتنی خوبصورت، میرے لیے اتنا ہی بہت کافی ہے۔"

عمر میں پہلی دفعہ اس خوش دل عورت کے چہرے پر فکر کی ایک پرچھائیں نظر آئی اور اس شام کو اس نے اپنے دوستوں سے کہا: "یہ ہے زندگی! ابھی آدمی اپنے پیالے کو پورا پینے بھی نہیں پاتا کہ دوسرے اسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیتے ہیں......"

واقعہ یہ ہے کہ شروع میں تو ماں اور بیٹی کے درمیان رقابت کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے، بیٹی اپنا احتاط اور باحجاب انداز رکھتی تھی۔ وہ اپنی لمبی لمبی پلکوں کے پیچھے

سے دنیا کو دیکھتی تھی اور مردوں کے سامنے بہت کم زبان کھولتی تھی۔ اور ماں کی آواز ہمیشہ سے زیادہ دل ربائی کے انداز میں گونجنے لگی تھی اور اس کی آنکھیں اور زیادہ آرزو مندی کے ساتھ تاباں اور سوزاں ہو گئی تھیں۔

اس کے سامنے لوگ اس طرح سرخ ہو جاتے تھے جیسے طلوع آفتاب کے وقت بادبان ہو جاتے ہیں جب کہ سورج کی پہلی کرن انہیں چھوتی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بہت لوگوں کے لیے نونسیا یوم محبت کی پہلی کرن تھی اور جب وہ ایک ستون کی مانند سیدھی اور نازک، اپنی چھوٹی سی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتی تھی اور اس کی آواز مکانوں کی چھتوں پر گونجتی تھی تو بہت سے لوگ خاموش تشکر کے ساتھ اسے دیکھا کرتے تھے۔ بازار میں بھی جب وہ اپنی شوخ رنگ ترکاریوں کے انبار کے پاس کھڑی ہوئی گرجا کی سفید دیوار کے پس منظر میں کسی عظیم مصور کا پارہ فن معلوم ہوتی تھی اس وقت بھی وہ بڑی حسین اور دلکش دکھائی دیتی تھی۔ اس کی مقررہ جگہ سان گیا کومو گرجا کے برابر، سیڑھیوں کے بائیں جانب تھی اور وہ انہی سیڑھیوں سے دو تین قدم کے فاصلے پر ختم بھی ہوتی تھی۔ وہ وہاں کھڑی ہوئی اور اپنے مذاقوں، اپنی ہنسی اور اپنے گیتوں کو...... جو اسے ہزاروں کی تعداد میں یاد تھے...... مجمع کے سروں پر چمکتی دمکتی چنگاریوں کی طرح برساتی ہوئی بڑی ہی دلکش و رعنا معلوم ہوتی تھی۔

اسے پہننے اوڑھنے کا بڑا اچھا سلیقہ تھا، وہ اس طرح کپڑے پہننا جانتی تھی کہ اس کے حسن کو چار چاند لگ جائیں، جس طرح ایک بلوریں قرابے میں اچھی شراب کی خوبی دوبالا ہو جاتی ہے: شیشہ جتنا زیادہ شفاف ہوتا ہے شراب کی جان اسی قدر اچھی طرح نظر آتی ہے کیونکہ رنگ ہمیشہ مزے اور خوشبو میں اضافہ کرتا ہے اور وہ اس شاندار اور حسین نغمۂ بے آواز کو اس کے آخری سر تک بجاتا چلا جاتا ہے جسے ہم اپنی روح میں سورج کے خون کا تھوڑا سا شائبہ پیدا کرنے کے لیے پیتے ہیں۔ شراب! خدا کی قسم یہ دنیا اور اس کی تمام ہاؤ ہو ایک خچر کے سم کے برابر وقعت کی بھی حامل نہ ہوتی اگر انسان کو سرخ شراب کے ایک لبریز جام سے اپنی بے کیف روح کو سیراب کرنے کا مدہر موقع نصیب نہ ہوتا...... اس شراب سے جو شرکت عشائے ربانی کی طرح ہمارے سب گناہ

دھو ڈالتی ہے اور ہمیں اس دنیا سے عفو اور محبت کے ساتھ پیش آنا سکھاتی ہے جو اتنی زیادہ بدصورتی سے بھرپور ہے۔ اپنے جام ارغواں کی مدد سے سورج کو دیکھو اور وہ تمہیں ایسی ایسی داستانیں سنائے گا جو کبھی تمہارے خواب وخیال میں بھی نہ آئی ہوں گی......

نونسیا سورج کی کرنوں میں نہائی ہوئی کھڑی ہے اور اپنے اردگرد کے لوگوں کے دلوں کو پرمسرت خیالات اور اس کی......نونسیا کی......نگہِ التفات سے فیض یاب ہونے کی آرزو سے سرشار کر رہی ہے۔ جب ایک حسین عورت قریب موجود ہو تو کوئی مرد زیادہ سے زیادہ چمکنے کی کوشش کرتا ہے۔ نونسیا اس طرح خیر و خوبی کا ایک سرچشمہ تھی، اس نے بہت سے قوتوں کو بیدار کیا تھا، ان میں جان ڈالی تھی۔ خوب سے خوب تر کی خواہش پیدا ہونا لازمی ہے۔

اور اب بیٹی اکثر ماں کے پہلو میں کھڑی ہوئی نظر آنے لگی ہے۔ ایک راہبہ کی سی باحیا اور بے ادعا یا ایک میان میں رکھا ہوا خنجر۔ مرد دونوں کو دیکھتے ہیں اور مقابلہ کرتے ہیں اور شاید ان میں سے بعض کو اندازہ ہونے لگا ہو کہ کبھی کبھی ایک عورت کے کیا جذبات ہوتے ہیں اور اس کے لیے زندگی کتنی کٹھور ہو سکتی ہے۔

وقت گزرتا جا رہا ہے اور اپنے تیز قدموں کو تیز تر کر رہا ہے اور وقت کے سامنے انسانوں کی وہ حیثیت ہے جو سورج کی کرنوں میں گرد کے ذروں کی۔ نونسیا کی پیشانی پر اب اکثر بل پڑنے لگے ہیں جس کی وجہ سے اس کی گھنی بھوئیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اور بعض دفعہ وہ اپنے ہونٹ کاٹ کر اپنی بیٹی کو اس نظر سے دیکھتی ہے جس نظر سے ایک جواری یہ معلوم کرنے کی کوشش میں دوسرے جواری کو دیکھتا ہے کہ اس کے پاس کون سے پتے ہیں۔

ایک سال گزرا، پھر ایک اور سال گزر گیا اور بیٹی ماں سے زیادہ سے زیادہ قریب آتی گئی اور زیادہ سے زیادہ دور ہٹتی گئی۔ اب لوگوں پر صاف ظاہر ہو چکا تھا کہ نوجوانوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اپنی محبت پاش نگاہوں کا مرکز کسے بنائیں......ماں کو یا بیٹی کو۔ اور نونسیا کی سہیلیاں، جو سب سے زیاہ کاری زخم لگانا جانتی

ہیں، اسے چڑانے اور چھیڑنے لگیں:

''کیوں نونسیا کیا بیٹی کے سامنے تمہاری خوبصورتی ماند پڑ جائے گی؟''

لیکن نونسیا ہنسی اور بولی: ''بڑے ستارے اس وقت بھی نظر آتے ہیں جب چاند نکلا ہوا ہوتا ہے۔''

ماں کی حیثیت سے وہ اپنی بیٹی کے حسن پر نازاں تھی، عورت کی حیثیت سے وہ نینا کی جوانی پر رشک کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ نینا اس کے اور سورج کے بیچ میں آ گئی تھی اور نونسیا سائے میں رہنا پسند نہیں کرتی تھی۔

لانو نے ایک نیا گیت بنایا جس کے پہلے بول کچھ اس طرح کے تھے:

اگر میں مرد ہوتی تو میں

اپنی محبوبہ سے ایک ایسی ہی حسینہ کو جنم دلواتی جیسی حسینہ کو بھی میں نے جنم دیا تھا

اور دھرتی کو نالا مال کیا تھا!

نونسیا یہ گیت گانا نہیں چاہتی تھی۔ سننے میں آ رہا تھا کہ نینا نے کئی دفعہ اپنی ماں سے کہا تھا:

''اگر تم زیادہ محتاط طبیعت کی ہوتیں تو ہم بہتر زندگی گذار سکتے تھے۔''

اور ایک دن وہ بھی آیا جب بیٹی نے ماں سے کہا:

''ماں تم مجھے ضرورت سے زیادہ پیچھے رکھتی ہو۔ میں اب بچہ نہیں رہی ہوں۔ اور میں بھی جینا چاہتی ہوں۔ تم نے اپنے زمانے میں رنگ رلیاں کر لیں اور اب کیا زندگی سے لطف اٹھانے کے میرے دن نہیں ہیں؟''

''کیا بات ہے؟'' ماں نے پوچھا لیکن اس نے قصوروارانہ انداز سے اپنی نظریں جھکا لیں کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ کیا بات ہے۔

اسی زمانے میں انریکو بوربو نے آسٹریلیا سے واپس آیا۔ وہ اس حیرت انگیز ملک میں لکڑہارے کا کام کرتا تھا جہاں ہر آدمی کے لیے ہن برستا تھا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے اپنے وطن کے سورج سے حرارت پانے کے لیے آیا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ پھر اسی

دیش کولوٹ جائے جہاں کی زندگی اپنے وطن کی زندگی سے زیادہ آزادانہ تھی۔ وہ ایک چھتیس سالہ، خوش باش قسم کا دیوہیکل اور ڈاڑھی والا آدمی تھا، اس کی طبیعت میں زندہ دلی اور چونچالی تھی اور وہ گھنے جنگلوں کی زندگی اور اپنے کارناموں کے بارے میں مزے دار اور مسحور کن قصے سناتا تھا۔ اور ہر شخص کا خیال تھا کہ وہ من گھڑت افسانے سنا رہا ہے لیکن ماں اور بیٹی اس کے تمام افسانوی کو حقیقت سمجھتی تھیں۔

''مجھے صاف نظر آتا ہے کہ اذریکو مجھے پسند کرتا ہے۔'' نینا نے کہا ''لیکن تم اس سے عشوہ بازی کرتی ہو اور اس کی وجہ سے اس میں لاابالی پن آجاتا ہے اور یہ میرے حق میں برا ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں۔'' نونسیا نے کہا ''اچھا تمہارے لیے کنواری مریم سے اپنی ماں کی شکایت کرنے کی کوئی وجہ نہیں پیدا ہوگی۔''

اور وہ اس شخص سے دست بردار ہوگئی جو ہر شخص جانتا تھا کہ اُسے اور زیادہ تر لوگوں سے زیادہ عزیز ہے۔

لیکن یہ تو مشہور بات ہے کہ آسانی سے حاصل کی ہوئی فتوحات آدمی کا دماغ خراب کر دیتی ہیں اور خصوصاً اس صورت میں جبکہ فاتح بہت نوعمر ہوں۔

نینا اپنی ماں سے اس طرح ہم کلام ہونے لگی جس کی نونسیا قطعی سزاوار نہیں تھی۔ اور ایک دن......وہ سان گیا کومو کا دن تھا جو ہمارا تہوار کا دن ہے...... جب ہر ایک تفریح کر رہا تھا اور نونسیا نے بہت ہی خوش اسلوبی سے تارانتیلا رقص ختم کیا ہی تھا کہ اس کی بیٹی نے خوب زور سے، تاکہ ہر ایک سن سکے، اس سے کہا:

''ماں تم ضرورت سے زیادہ نہیں ناچ رہی ہو کیا؟ تمہاری عمر میں تمہارے دل کے لیے ممکن ہے یہ بات اچھی نہ ہو......''

وہ سب لوگ جنہوں نے یہ نرم لہجے میں کہے ہوئے گستاخانہ الفاظ سنے لمحہ بھر کے لیے ساکت رہ گئے اور نونسیا اپنے نازک کولہوں پر ہاتھ رکھ کر غصے سے چلائی:

''میرا دل؟ تمہیں میرے دل کی طرف سے فکر ہے؟ اچھا بچی شکریہ تمہارا!

لیکن ہم دیکھیں گے کہ کس کا دل زیادہ مضبوط ہے!''

اور لمحہ بھر کچھ سوچنے کے بعد اس نے تجویز پیش کی:

''میں یہاں سے لے کر فوارے تک اور فوارے سے یہاں تک تین مرتبہ تمہارے ساتھ دوڑ لگاؤں گی، اور بغیر بیچ میں کہیں رکے ہوئے......''

بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ پورا قصہ سرے سے بے تکا ہے اور ان میں سے بعض تو اسے بہت ہی شرمناک سمجھ رہے تھے لیکن زیادہ تر لوگوں نے نونسیا کی خاطر بناوٹی سنجیدگی کے ساتھ اس کی تجویز کی تائید کی اور اصرار کیا کہ نینا اپنی ماں کی دعوت مقابلہ کو قبول کرے۔

جج چن لئے گئے اور دوڑ کی میعاد مقرر کر دی گئی۔ اس طرح دوڑ کے تمام ضابطوں پر عمل کیا گیا۔ بہت سے لوگ......مرد اور عورتیں......خلوص دل سے چاہتے تھے کہ ماں جیت جائے اور انہوں نے اس کے لیے دعا کی اور مقدس مریم کی منت کہ وہ اسے قوت عطا کریں اور اس کی مدد کریں۔

اور اب ماں اور بیٹی دونوں پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں، وہ ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہی تھیں۔ گھنٹی بجی اور وہ سڑک پر دو بڑے بڑے سفید پرندوں کی طرح چوک کی جانب دوڑنے لگیں، ماں کے سر پر ایک لال رومال بندھا تھا اور بیٹی کے سر پر ہلکے نیلے رنگ کا۔

دوڑ کے پہلے ہی منٹ سے یہ بات بالکل صاف تھی کہ ماں بیٹی کی نسبت زیادہ مضبوط بھی ہے اور زیادہ سبک رفتار بھی۔ نونسیا اتنی آسانی اور سبک پائی اور خوبصورتی سے دوڑ رہی تھی جیسے خود دھرتی اسے اپنی آغوش میں لے جا رہی ہو جس طرح ماں بچے کو لے جاتی ہے۔ کھڑکیوں میں بیٹھے ہوئے لوگ اس کے قدموں پر پھول نچھاور کر رہے تھے اور چیخ رہے تھے اور اس کی ہمت افزائی کر رہے تھے۔ دوسری دوڑ میں وہ اپنی بیٹی سے چار منٹ آگے ہوگئی اور نینا جو اپنی شکست کی وجہ سے پریشان اور پست ہوگئی تھی ہانپتی ہوئی گرجا کی سیڑھیوں پر گر پڑی اور تیسری دفعہ نہیں دوڑ سکی۔

نونسیا، ایک بلی کی طرح تازہ دم، اس کے اوپر جھکی اور دوسروں کے ساتھ مل

کر ہنسنے لگی۔

''بچی'' اس نے لڑکی کے پریشان بالوں کو اپنا مضبوط ہاتھ سے تھپکتے ہوئے کہا ''تمہیں جاننا چاہئے کہ کھیل، کام اور محبت سب چیزوں میں مضبوط ترین دل اس عورت کا دل ہے جو زندگی کی آزمائش سے گزر چکی ہے اور وہ تیس سے خاصی اوپر عمر ہونے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ سو کڑھو مت، بچی۔''

اور دوڑ کے بعد ذرا سا آرام لئے بغیر نونسیا نے پھر تارانتیلا کی دھن چھیڑنے کو کہا:

''میرے ساتھ کون ناچتا ہے؟''

انریکو آگے بڑھا اور اس نے اپنی ٹوپی اتار کر اس حیرت انگیز عورت کے حضور میں نہایت احترام سے سر جھکا کر اسے تعظیم دی۔

تب طنبوروں نے اس آتشیں رقص کی تڑپتی پھڑکتی دھن چھیڑ دی جو سیاہی مائل، پرانی اور پکی شراب کی طرح نشہ آور ہے۔ اور نونسیا پھرکی کی طرح گھومنے اور تھرکنے اور سانپ کی طرح بل کھانے لگی۔ وہ اس رقص کو جو جذبۂ شدید کا مظہر تھا خوب اچھی طرح سمجھتی تھی اور اس کے ناقابل تسخیر اور غضب کے خوبصورت جسم کی لچکیلی حرکات کا نظارہ جنت نگاہ سے کم نہیں تھا۔

وہ بہت دیر تک رقص کناں رہی اور بہت لوگوں کے ساتھ ناچی، اس کے ساتھی تھک گئے لیکن وہ تھی کہ سیر ہی ہونے میں نہیں آتی تھی اور آدھی رات گزر چکی تھی جس وقت اس نے چلا کر کہا:

''آؤ، انریکو، آخری دفعہ اور ہو جائے!'' اور اس نے آہستہ آہستہ اس کے ساتھ ناچنا شروع کیا۔ اس کی آنکھیں چوڑی ہو گئیں اور ان میں وعدۂ محبت کی روشنی چھلکنے لگی۔ پھر یکبارگی اس نے ایک مختصر سی چیخ ماری، اپنے بازو اوپر اٹھائے اور اس طرح زمین پر جا پڑی گویا اسے کسی نے مار گرایا ہو۔

ڈاکٹر نے کہا کہ وہ دل کی حرکت بند ہونے کے سبب مری ہے۔

شاید......

میکسم گورکی

حقارت

صبح سویرے سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی لیکن دوپہر ہوتے ہوتے بادلوں میں زیادہ رطوبت نہیں رہی، ان کا سیاہ پارچہ تار تار سا ہو گیا اور ہوا نے پھاڑ کر اس کی دھواں دھواں سی دھجیاں بکھیر دیں اور اسے اڑا کر سمندر کی سمت لے گئی اور وہاں وہ پھر ایک دبیز، نیلگوں خاکستری رنگ کے تودہ میں تبدیل ہو گیا جو بارش کی وجہ سے ساکن سمندر پر ایک گہرا سایہ ڈال رہا تھا۔

مشرق میں سیاہ آسمان پر بجلی کوندرہی تھی اور شاندار سورج جزیرے پر اپنی خیرہ کن روشنی ڈال رہی تھا۔

دور سمندر سے دیکھنے سے یہ جزیرہ کسی تہواری جشن کے دن کے مندر کی طرح معلوم ہوتا ہوگا...... ہر چیز اس میں اتنی صاف ستھری چمکتی دمکتی اور شوخ رنگ پھولوں سے آراستہ تھی، بارش کے بڑے بڑے قطرے ہر طرف چمک رہے تھے اور وہ انگور کی بیلوں کے زردی مائل نوخیز پتوں پر پکھراج، وسٹیریا کے گچھوں پر یاقوت، سرخ جیرانیم کے پھولوں کے اوپر لعل اور گھاس کے، سبز سبز جھاڑیوں کے اور درختوں کے پتوں کے اوپر فراوانی سے بکھرے ہوئے زمردوں کی مانند معلوم ہو رہے تھے۔

ہر طرف سکوت طاری تھا، جیسا کہ بارش کے فوراً بعد ہمیشہ ہوتا ہے اور صرف چٹانوں کے درمیان اور یوفوربیا کی جڑوں کے، ڈیو بیری کے اور خوشبودار، لہراتی ہوئی

کلیماٹس کی بیلوں کے نیچے چھپی ہوئی پہاڑی ندی کے بہنے کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ نیچے کی طرف سمندر دھیرے دھیرے سرگوشیاں کر رہا تھا۔

فرز کے سنہری تیر آسمان کی طرف منہ اٹھائے، آہستہ آہستہ جھوم رہے تھے، وہ رطوبت سے بھرپور تھے اور اسے بے آواز طریقے سے اپنے غیر معمولی قسم کے شگوفوں سے نیچے گرا رہے تھے۔

ہرے رنگ کے بھرپور اور فراواں پس منظر میں ہلکے ارغوانی رنگ کے وسٹیریا گہرے سرخ رنگ کے جیرانیم اور گلابوں کو دعوت مقابلہ دے رہے تھے، کلیماٹس کے شگوفوں کا ملگجے زرد رنگ کا کمخواب سوسن اور گلی فلاور کے سیاہی مائل مخمل سے ہم کنار ہو رہا تھا اور یہ سب کچھ اس قدر تابندہ، روشن اور شوخ رنگ تھا کہ پھول وائلن، بانسری اور جذبات سے پر وائلن چیلو کی طرح سنگیت پیدا کرتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

بھیگی ہوئی ہوا عطر بار تھی اور پرانی، تیز شراب کی طرح نشہ آور۔

ایک بھوری چٹان کے نیچے، جو بارود سے اڑائے جانے کی وجہ سے ٹوٹی پھوٹی تھی اور جس کے شگافوں میں زنگ آلود لوہے کے داغ دکھائی دے رہے تھے، اور ڈائنا مائٹ کی کھٹی کھٹی بو خارج کرتے ہوئے، زرد اور بھورے پتھروں کے درمیان گیلے، بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس اور چمڑے کے چپل پہنے ہوئے چار ہٹے کٹے کان مزدور بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔

وہ ایک بڑے سے پیالے میں سے آہستہ آہستہ لیکن بڑے ذوق وشوق سے کھانا کھا رہے تھے، وہ پیالہ زیتون کے تیل میں پکے ہوئے آکٹوپس کے سخت گوشت اور آلو اور ٹماٹر سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ اور کھانے کو وہ ایک بوتل میں سے باری باری سرخ شراب پی کر نیچے اتار رہے تھے۔

دو آدمیوں کی ڈاڑھی مونچھ منڈی ہوئی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر ملتے ہوئے تھے کہ صاف بھائی، بلکہ توام بھائی معلوم ہو رہے تھے۔ تیسرا ایک پستہ قد اور بینڈی ٹانگوں والا کانا شخص تھا جس کی تیز تیز، گھبرائی ہوئی حرکت اور اشارے

اسے ایک بوڑھے، سوکھے سہمے پرندے سے مشابہ کر رہے تھے۔ چوتھا ایک چوڑے شانوں اور جھکی ہوئی نکیلی ناک والا، دڑھیل، ادھیڑ آدمی تھا۔ اور اس کے بالوں میں نقرئی تاروں کی کافی آمیزش تھی۔

روٹی کے بڑے بڑے ٹکرے توڑ کر اس چوتھے آدمی نے اپنے شراب سے تر گل مچھوں پر ہاتھ پھیر کر انہیں ٹھیک کیا اور اپنے منہ کے سیاہ غار میں روٹی کا ایک ٹکڑا ٹھونس لیا۔

''یہ بکواس ہے'' وہ کہہ رہا تھا اور اس کا جبڑا باقاعدگی سے ہل رہا تھا۔ ''یہ جھوٹ ہے۔ میں نے کوئی برا کام نہیں کیا ہے......''

گھنی بھووں کے نیچے اس کی بھوری آنکھیں مضحکہ سا اڑاتی ہوئی لیکن خوشی سے عاری معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی آواز بھاری اور روکھی تھی اور وہ آہستہ آہستہ اور ٹھیر ٹھیر کر بات کرتا تھا۔ اس کی ہر چیز۔ اس کا ہیٹ، اس کا بالوں دار، بھدے نقشے والا چہرہ، اس کے بڑے بڑے ہاتھ اور اس کا پتھروں کے سفید ذروں سے بھرا ہوا گہرا نیلا سوٹ۔ اس بات کی آئینہ دار تھی کہ یہی وہ شخص ہے جس نے پہاڑ کے سینے میں سوراخ کئے تھے تاکہ اسے بارود سے اڑایا جا سکے۔

اس کے باقی تینوں ساتھی توجہ سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ اسے بیچ میں ٹوکتے نہیں تھے بلکہ تھوڑی دیر بعد منہ اٹھا کر اسے دیکھ لیتے تھے گویا یہ کہہ رہے ہوں: ''کہے جاؤ......''

اور وہ کہے گیا اور بولتے وقت اس کی بھویں اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔

''وہ آدمی ......اسے لوگ آندریا گراسو کے نام سے پکارتے تھے۔ رات کے وقت چوروں کی طرح ہمارے گاؤں میں داخل ہوا۔ وہ چیتھڑے لگائے ہوئے تھا، اس کا ہیٹ اس کے جوتوں کے رنگ کا تھا اور اسی قدر بوسیدہ۔ وہ لالچی، بے غیرت اور بے رحم تھا۔ اور سات سال بعد ہمارے بیچ لوگ اسے ٹوپی اتار اتار کر سلام کرتے تھے اور وہ مشکل ہی سے جواب میں سر ہلاتا ہوگا۔ اور چالیس میل ادھر اور ادھر تک ہر شخص اس کا

قرض دار تھا۔

''ہاں، ایسے لوگ ہوتے ہیں۔'' بینڈی ٹانگوں والے نے ٹھنڈا سانس بھر کر سر ہلاتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

داستان گو نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔

''تو تم اس قسم کے لوگوں سے بھی مل چکے ہو؟'' اس نے مذاق سا اڑانے کے انداز میں پوچھا۔

بوڑھے نے ایک بولتا ہوا سا اشارہ کیا، دونوں ڈاڑھی مونچھ صاف آدمی ایک ہی وقت میں مسکرائے، مڑی ہوئی، نکیلی ناگ والے کان کن نے شراب کی ایک چسکی لگائی اور نیلے آسمان پر اڑتے ہوئے باز کو دیکھتے ہوئے اپنا قصہ پھر شروع کر دیا:

''میں تیرہ برس کا تھا جب اس نے مجھے اور کچھ اور لوگوں کو اپنے مکان کے لیے پتھر ڈھونے پر نوکر رکھا۔ وہ ہمارے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتا تھا اور جب میرے دوست لوکینو نے اس سے یہی بات کہی تو وہ بولا: میرے کولہے بھی میرے ہیں لیکن تم میرے لیے اجنبی ہو۔ میں تمہارے ساتھ مہربانی سے کیوں پیش آؤں؟، یہ الفاظ میرے دل میں تیر کی طرح لگے اور اس دن سے میں اس پر زیادہ تیز نظر رکھنے لگا۔ وہ ہر ایک سے کمینگی اور درندگی سے پیش آتا تھا، یہاں تک کہ بڈھوں بڑھیوں سے بھی، اس کے لیے بوڑھے جوان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اتنا میں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اور جب شریف لوگ اسے بتاتے تھے کہ اس کا رویہ بہت قابل اعتراض ہے تو وہ ان کے منہ پر ہنس دیتا تھا اور کہتا تھا: جب میں غریب تھا تو کسی نے میرے ساتھ اس سے بہتر سلوک نہیں کیا تھا۔، اس کا فقط پادریوں، کارابنیریوں اور پولیس والوں سے یارانہ تھا اور باقی لوگ تو اسے اسی وقت دیکھتے تھے جب ان پر کوئی سخت افتاد آن پڑتی تھی اور اس وقت وہ ان کے ساتھ جو اس کا دل چاہتا کر سکتا تھا۔

''ہاں ایسے لوگ بھی دنیا میں ہوتے ہیں۔'' بینڈی ٹانگوں والے نے دھیرے سے اپنی بات دہرائی اور باقی تینوں نے ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک

ڈاڑھی مونچھ مندے آدمی نے خاموشی سے شراب کی بوتل اس کی طرف بڑھا دی۔ بوڑھے نے بوتل لے لی، اسے روشنی کے سامنے کیا اور اپنے ہونٹوں تک لے جانے سے پہلے اس نے کہا:

''میں کنواری مریم کے مقدس دل کے نام پر پیتا ہوں!''

''وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ غریبوں نے ہمیشہ امیروں کے لیے اور بیوقوفوں نے عقل مندوں کے لیے کام کیا ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔''

داستان گو ہنسا اور بوتل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بوتل خالی تھی۔ اس نے لاپروائی سے اسے ہتوڑوں، کدالوں اور آتش گیر فتیلوں کے لچھوں کے برابر پتھروں پر پھینک دیا۔

''میرا اس وقت لڑکپن تھا اور مجھے یہ الفاظ بہت ہی ناگوار گزرے، اور اسی طرح میرے ساتھیوں کو بھی کیونکہ انہوں نے ہماری ایک بہتر زندگی کی تمناؤں اور امیدوں کو کچل ڈالا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بڑی رات گئے مجھے اور لوکینو کو وہ گھوڑے پر سوار کھیت میں سے گزرتا ہوا ملا۔ ہم نے اسے روک لیا اور مہذبانہ لہجے میں لیکن مضبوطی کے ساتھ اس سے کہا: ، ہماری درخواست ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں۔،''

ڈاڑھی مونچھ صاف نوجوان قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور کانا بھی آہستہ آہستہ اندر ہی اندر ہنسنے لگا، داستان گو نے ایک گہرا سانس لیا:

''ہاں ظاہر ہے یہ حماقت کی بات تھی! لیکن جوانی دیانت دار ہوتی ہے۔ جوانی کو الفاظ کی طاقت پر اعتقاد ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ جوانی۔ زندگی کا ضمیر ہے......''

''اچھا تو اس نے کیا کہا؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

''وہ گرج پڑا: میرے گھوڑے کو چھوڑ دو، بدمعاشو!، اور اس نے پستول نکال کر اس کا رخ ہماری طرف کر دیا۔ ہم نے کہا: آپ کو ہم سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، گراسو۔ اور خفا بھی نہ ہوئیے۔ ہم تو فقط آپ کو ایک مشورہ دے رہے ہیں!،''

"یہ بہت اچھی بات تھی!" ایک ڈاڑھی مونچھ منڈے نے کہا اور دوسرے نے اس سے اتفاق کرنے کے لیے سر ہلا دیا۔ بینڈی ٹانگوں والے نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور ایک پتھر کو تکنے اور اپنی ٹیڑھی میڑھی انگلیوں سے تھپ تھپانے لگا۔

کھانا ختم ہو گیا۔ ایک شخص ایک پتلی سے لکڑی سے گھاس کے اوپر پڑے ہوئے بارش کے شفاف قطروں کو گرا گرا کر دل بہلانے لگا۔ دوسرا اسے دیکھنے اور گھاس کے ایک سوکھے تنکے سے دانت کریدنے لگا۔ ہوا زیادہ گرم اور خشک ہو گئی۔ دوپہر کے لحاتی سائے تیزی سے غائب ہو رہے تھے۔ سمندر کی نرم نرم سرسراہٹ اس سنجیدہ داستان کی ہم نوائی کر رہی تھی۔

"اس ملاقات کا نتیجہ لوکینو کے حق میں برا ہوا۔ اس کے باپ اور چچا دونوں گراسو کے قرضدار تھے۔ بچارا لوکینو دبلا اور پریشان حال ہوتا چلا گیا، وہ اکثر اپنے دانت پیسنے لگا اور اس کی آنکھوں نے اپنی وہ چمک کھو دی جو کبھی لڑکیوں کو اس کی طرف کھینچتی تھی۔ اوہ، ایک دفعہ اس نے مجھ سے کہا، اس دن ہم نے یہ بڑی بے وقوفی کی حرکت کی۔ الفاظ اگر کسی بھیڑئے سے کہے جائیں تو وہ بالکل بیکار ہیں، لوکینو قتل کے لیے تیار ہے، میں نے دل میں سوچا۔ اس لڑکے اور اس کے اچھے خاندان پر مجھے بہت ترس آتا تھا۔ لیکن میں خود بھی غریب اور بے یار و مددگار تھا، کیونکہ میری ماں کچھ ہی دن پہلے مر چکی تھی۔"

مڑی ہوئی ناک والے شخص نے اپنی چونے کے داغ پڑی ہوئی انگلیوں سے اپنی ڈاڑھی مونچھوں کو ٹھیک کیا اور ایسا کرتے ہوئے اس کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر ایک بھاری سی نقرئی انگوٹھی چمکتی ہوئی دکھائی دی۔

"اگر میں اس چیز کو خاتمے تک پہنچا سکتا تو اپنے ہم جنسوں کے لیے ایک نیک کام کر سکتا لیکن میں نرم دل آدمی ہوں۔ ایک دن سڑک پر گراسو کو دیکھ کر میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور اپنے مقدور بھر مسکینی اور عاجزی سے اس سے کہنا شروع کیا: تم بڑے لالچی اور بدمزاج آدمی ہو۔ تمہارے ساتھ رہنا لوگوں کے لیے بہت کٹھن ہے۔ تم

بہت آسانی سے کسی کا ہاتھ زور سے پرے ہٹا سکتے ہو اور وہ ہاتھ چاقو کی طرف بڑھ سکتا ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ 'تم احمق ہو، لڑکے!'، اس نے کہا۔ لیکن میں برابر اصرار کیے گیا۔ 'سنو' اس نے ہنس کر کہا، تم مجھے تنگ نہ کرنے کے کتنے دام لو گے؟ ایک لیرا کافی ہوگا؟'، یہ میری توہین تھی لیکن میں نے اپنے غصے پر قابو رکھا، 'چلے جاؤ، میں تم سے کہتا ہوں۔'، ہم دونوں شانہ بہ شانہ چل رہے تھے اور میں اس کے دائیں طرف تھا۔ جس وقت میں ادھر نہیں دیکھ رہا تھا اس وقت میں اس نے اپنا چاقو نکال کر مجھ پر وار کیا۔ لیکن بائیں ہاتھ سے کوئی کام اچھی طرح نہیں ہو سکتا سو چاقو ایک انچ سے زیادہ میرے سینے میں نہیں گھس سکتا تھا۔ قدرتی بات ہے کہ پھر میں نے اسے زمین پر گرا کر خواب ہی خوب لاتیں لگائیں، جیسے کسی سور کو لاتیں ماری جائیں۔''

''اب تو شاید تم میرا مشورہ مان لو گے؟ جس وقت وہ زمین پر تکلیف سے بل کھا رہا تھا تو میں نے اس سے کہا۔''

دو ڈاڑھی منڈوں سے داستان گو پر بے یقینی کی نگاہیں ڈالیں اور پھر نظریں جھکا لیں۔ بینڈی ٹانگوں والا آدمی جھک کر اپنے چپلوں کے چمڑے کے تسمے باندھنے لگا۔

''اگلے دن میں ابھی بستر سے اٹھا بھی نہیں تھا کہ کارابینیری آ کر مجھے گاؤں کے افسر اعلیٰ کے پاس لے گئے جو گراسو کا یار تھا۔ 'تم ایماندار آدمی ہو، چیرو'، اس نے مجھ سے کہا اس لیے تم اس بات سے انکار نہیں کرو گے کہ کل رات تم نے گراس کو قتل کرنے کی کوشش کی۔'، میں نے کہا کہ اصل واقعہ یہ نہیں تھا لیکن وہ لوگ ہر چیز کو اپنے ایک مخصوص طریقے سے دیکھتے ہیں۔ سو انہوں نے دو مہینے تک تو مقدمے سے پہلے ہی مجھے جیل میں ڈالے رکھا اور اس کے بعد مجھے ایک سال آٹھ مہینے کی قید کی سزا سنا دی گئی۔

'اچھی بات ہے' میں نے ججوں سے کہا، 'لیکن ابھی اس قصے کا خاتمہ نہیں ہوا ہے!''

اس نے پتھروں کے درمیان کسی ایک کونے سے ایک نئی بوتل نکالی اور اسے اپنی مونچھوں کے نیچے لے جا کر شراب کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا۔ اس کا بالوں دار کنٹھا

پیاسے انداز سے اوپر نیچے ہونے لگا اور اس کی ڈاڑھی کے بال کھڑے سے ہو گئے۔ چھ آنکھیں متین خاموشی کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھیں۔

''اس کا ذکر خاصا اکتا دینے والا ہے۔'' اس نے اپنے ساتھیوں کو بوتل پکڑا کر اپنی ڈاڑھی کو ہاتھ سے درست کرتے ہوئے کہا۔

''جب میں اپنے گاؤں لوٹا تو میں نے دیکھا کہ وہاں میرے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، ہر شخص، مجھ سے ڈرتا تھا۔ لوکینو نے مجھے بتایا کہ اس سال حالت اور بھی خراب ہو گئی تھی۔ وہ بچارا لڑکا ان قصوں سے عاجز آچکا تھا۔ اچھی بات ہے، میں نے دل ہی دل میں کہا اور اس شخص گراسو کے پاس پہنچا۔ مجھے دیکھ کر اس کا ڈر کے مارے برا حال ہو گیا۔ لو میں واپس آ گیا ہوں، میں نے اس سے کہا اب تمہاری باری یہاں سے جانے کی ہے! اس نے اپنی رائفل اٹھا کر میرے اوپر گولی چلا دی، لیکن اس میں پرندوں کے شکار کے کارتوس بھرے ہوئے تھے اور اس نے میری ٹانگ کا نشانہ لیا تھا۔ میں گرا تک نہیں۔ اگر تم مجھے مار ڈالتے تب بھی میں قبر سے نکل کر آتا اور بھوت بن کر تمہیں چمٹ جاتا، میں نے اس سے کہا۔ میں نے کنواری مریم سے قسم کھا کر عہد کیا ہے کہ تمہیں یہاں سے نکال کر ہی دم لوں گا۔ تم ضدی آدمی ہو لیکن میں بھی ضدی ہوں۔، ہمارے درمیان ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی اور میں نے بے ارادہ، اتفاق سے اس کا بازو توڑ دیا۔ میرا ارادہ اس کے ساتھ تشدد برتنے کا نہیں تھا اور اس نے پہلے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ بہت لوگ اکٹھے ہو گئے اور مجھے وہاں سے لے جایا گیا۔ اس دفعہ مجھے تین سال نو مہینے کی قید ہوئی۔ جب میری قید کی میعاد ختم ہو گئی تو وارڈن نے جو پوری کہانی جانتا تھا اور مجھے پسند کرتا تھا، مجھے گھر لوٹنے سے باز رکھنے کی بہت زیادہ کوشش کی۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے اپنے داماد کے یہاں کام دلوا دے گا جو آپولیا میں زمین کے ایک بڑے قطعے اور ایک انگوروں کے باغ کا مالک ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ میں نے جو کام اپنے ذمے لیا تھا اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ سو میں گھر پہنچ گیا۔ اس دفعہ میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ بیکار اور بے معنی بکواس نہیں کروں گا کیونکہ اب میں نے سیکھ لیا تھا کہ دس میں سے نو الفاظ بیکار

ہوتے ہیں۔ مجھے اس سے فقط ایک بات کہنی تھی: 'نکل جاؤ!' میں اتوار کے دن اپنے گاؤں پہنچا تھا سو میں سیدھا گرجا کی طرف گیا جہاں نماز ہو رہی تھی۔ گراسو وہیں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ گرجا میں ادھر سے ادھر دوڑنے اور بری طرح چلانے لگا یہ آدمی یہاں مجھے قتل کرنے آیا ہے۔ شہریو! شیطان نے اسے میری روح حاصل کرنے کے لیے بھیجا ہے!، اس سے پہلے ہی کہ مجھے اس کو ہاتھ تک لگانے کا وقت ملتا، یا اسے بتانے کا کہ میں اسے کیا چاہتا ہوں، لوگوں نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا۔ لیکن اس سے کوئی حرج نہیں ہوا کیونکہ اس پر دورہ پڑ گیا اور وہ پتھریلے فرش پر گر پڑا۔ اس کے پورے داہنے حصے اور زبان پر فالج گر پڑا تھا۔ سات ہفتے بعد ہو مر گیا...... بس۔ اور لوگوں نے مرے متعلق ایک قسم کی دیو کہانی بنالی۔ یہ خوفناک، مگر بکواس کا بھی اس میں بڑا حصہ ہے۔"

وہ اندر ہی اندر ہنسا، نظر اٹھا کر سورج کو دیکھا اور بولا:

"کام شروع کرنا چاہیے، وقت ہو گیا......"

باقی تینوں خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مڑی ہوئی ناک والا شخص چٹان کی زنگ آلود اور تیل سے بھری ہوئی درزوں کو تکتے ہوئے بولا:

"چلو کام شروع کریں......"

سورج نصف النہار پر تھا اور سارے کے سارے سائے چھوٹے ہو کر غائب ہو چکے تھے۔

افق پر جو بادل تھے وہ سمندر کے اندر گھس گئے سمندر پہلے سے بھی زیادہ پرسکون اور زیادہ نیلا ہو گیا تھا۔

میکسم گورکی

حسرت

پیپے کی عمر دس سال ہے، وہ ایک چھپکلی کی طرح نازک بدن، دبلا اور پھرتیلا ہے، اس کے پھٹے پرانے پیوند لگے ہوئے کپڑے اس کے تنگ شانوں پر سے لٹکتے رہتے ہیں اور اس کی دھوپ اور خاک دھول سے سیاہ شدہ کھال ان کے بے شمار سوراخوں میں سے جھانکتی رہتی ہے۔

وہ گھاس کی ایک سوکھی ہوئی پتی سے ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے جسے سمندری ہوا ادھر سے ادھر اڑاتی رہتی ہے۔ دن چڑھنے سے سورج ڈوبنے تک پیپے جزیرے میں ایک پتھر سے دوسرے پر کودتا پھاندتا رہتا ہے اور ہر وقت اس کی چھوٹی سی ان تھک آواز گاتی ہوئی سنائی دے سکتی ہے:

خوبصورت اطالیہ

میرا اپنا اطالیہ!

اسے ہر چیز سے دلچسپی ہے: اچھی دھرتی پر نہایت فراوانی سے اگنے والے پھولوں سے، ارغوانی پتھروں پر لپکتی جھپکتی چھپکلیوں سے، زیتون کے درختوں کے انتہائی سبک دستی کے ساتھ ترشے ہوئے پتوں اور انگور کی بیلوں کے ملاکیٹ کے سے سبز رنگ کے نقش و نگار کے درمیان رہنے والی چڑیوں سے، سمندر کی تہ کے تاریک باغوں میں رہنے والی مچھلیوں سے اور شہر کی تنگ اور پیچ و خم کھاتی ہوئی سڑکوں پر پھرتے ہوئے

بدیشیوں سے۔ موٹے جرمن سے جس کے چہرے پر تلوار کے وار کا نشان ہے، اس انگریز سے جس کو دیکھ کر ہمیشہ کسی ایسے اداکار کا خیال آتا ہے جو کسی مردم بیزار کردار کی اداکاری کر رہا ہو، اس امریکی سے جو انگریز دکھائی دینے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے اور جھنجھنے کی طرح پر شور، بے مثل فرانسیسی سے۔

''کیا چہرہ ہے!'' پیپے اپنی تیز بین آنکھوں سے اس جرمن کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے جو اپنی اہمیت کے احساس سے اس قدر پھولا ہوا ہے کہ اس کے بال تک کھڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ''ارے اس کا تو چہرہ ہی میرے پیٹ جلتا ہے!''

پیپے جرمنوں کو پسند نہیں کرتا، اس کے خیالات اور جذبات بھی وہی ہیں جو سڑکوں، چوکوں اور ان چھوٹے چھوٹے تنگ و تاریک شراب خانوں کے ہیں جہاں شہر کے لوگ شراب پیتے ہیں، تاش کھیلتے ہیں، اخبار پڑھتے ہیں اور سیاست پر بات چیت کرتے ہیں۔

''بلقان کے سلافی لوگ'' وہ لوگ کہتے ہیں ''ہم غریب جنوب والوں سے اس سے کہیں زیادہ قریب ہیں جتنے ہمارے اچھے اتحادی ہیں جنہوں نے ہماری دوستی کے انعام میں ہمیں افریقہ کے ریتلے صحراؤں کا تحفہ دیا ہے۔''

جنوب کے سیدھے سادے لوگ یہ بات روز بروز زیادہ سے زیادہ کہنے لگے ہیں اور پیپے سب کچھ سنتا ہے اور کچھ نہیں بھولتا۔

ایک بے کیف سا انگریز اپنی قینچی نما ٹانگوں سے چلتا ہوا کہیں جا رہا ہے۔ اس کے آگے پیپے کوئی چیز گنگناتا جا رہا ہے جو کسی ماتمی نوحے سے ملتی جلتی ہے یا محض ایک غم آگیں گیت ہے:

میرا دوست مر گیا،
میری بیوی غمگین ہے......
اور میں نہیں جانتا
اسے کیا روگ لگ گیا......

پیپے کے یار دوست ہنسی کے مارے لوٹن کبوتر بنے پیچھے پیچھے چلے آرہے ہیں اور جب بھی وہ بدیشی اپنی بے آب آنکھوں سے ان پر ایک پرسکون نگاہ ڈالتا ہے تو وہ جھاڑیوں میں یا دیواروں کے پیچھے چھپنے کے لئے چوہوں کی طرح پھرتی سے بھاگ لیتے ہیں۔

پیپے کے متعلق بے شمار دل چسپ داستانیں سنائی جاسکتی ہیں۔

ایک دن ایک سینورا نے اسے اپنے باغ کے سیبوں کی ایک ٹوکری دے کر اپنی سہیلی کے گھر بھیجا۔

''میں تمہیں ایک سولڈو دوں گی!'' اس نے کہا ''تم مزے سے اسے خرچ کرنا۔''

پیپے نے آمادگی سے ٹوکری اٹھائی، اسے اپنے سر پر جمایا اور چل پڑا۔ بالکل شام ہوچکی تھی جب وہ سولڈو لینے کے لیے آیا۔

''تمہیں معلوم ہوتا ہے کوئی جلدی نہیں تھی۔'' عورت بولی۔

''اوہ، اچھی سینورا، میں تھک بہت گیا ہوں!'' پیپے نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ''آپ جانیں وہ دس سے زیادہ تھے!''

''ہاں، اور کیا، دس سے زیادہ تو تھے ہی! پوری بھری ہوئی ٹوکری تھی!''

''سینورا سیب نہیں، لڑکے۔''

''لیکن سیبوں کا کیا ہوا؟''

''پہلے لڑکوں کو لیجئے سینورا: میٹیل، گیووانی......''

عورت کو غصہ آگیا۔ اس نے پیپے کے کندھے پکڑ لئے اور اسے خوب ہلایا:

''جواب دو میری بات کا تم نے سیب پہنچائے یا نہیں؟'' وہ چلائی۔

''میں انہیں چوک تک لے گیا، سینورا! ذرا سنئے تو میں کتنا اچھا رہا، شروع میں تو میں نے ان کے مذاقوں اور فقروں پر کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ مجھے گدھے سے تشبیہ دے رہے ہیں تو دینے دو، میں سینورا کی خاطر، آپ کی خطر سینورا، اسے برداشت کرلوں گا۔ لیکن جب وہ میری ماں کا مذاق اڑانے لگے تو میں نے سوچا کہ بس بہت سہ لیا۔ میں نے ٹوکری زمین پر رکھ دی اور آپ ذرا دیکھتیں سینورا

کہ میں نے کتنے مزے سے ان ننھے شیطانوں کے تاک تاک کر وہ سیب مارے ہیں۔ آپ کو بڑا لطف آتا!''

''انہوں نے میرے پھل چرا لیے!'' عورت چلائی۔

پیپے نے افسردگی سے ایک آہ بھری۔

''نہیں، نہیں'' اس نے کہا ''جن سیبوں کا نشانہ خطا گیا وہ تو دیوار سے ٹکرا کر کچل کچلا گئے لیکن باقی ہم لوگوں نے کھا لئے۔ جب میں اپنے دشمنوں کو ہرا چکا اور اس کے بعد ان کے ساتھ صلح کر لی......''

اس عورت نے پیپے کے چھوٹے سے گنجے سر پر گالیوں کی بوچھار کر دی۔ وہ توجہ کے ساتھ اور مسکینی سے سنتا رہا اور کبھی کبھی کسی بہت ہی چٹپٹے فقرے پر تعریفی انداز میں چٹخارہ سا لے لیتا تھا۔ ''اوہو یہ تو بڑا زوردار فقرہ ہے! کیا زبان ہے!''

اور پھر جب آخر کار اس کا غصہ اتر گیا اور وہ پیپے کو چھوڑ کر جانے لگی تو پیپے اس کے پیچھے چیخا:

''اگر آپ یہ دیکھتیں کہ میں نے کس خوبصورتی سے آپ کے ان عمدہ سیبوں سے ان نکمے لڑکوں کے گندے سروں پر نشانے لگائے ہیں تو آپ اس طرح محسوس نہ کرتیں۔ اگر آپ یہ واقعہ دیکھ سکتیں تو یقیناً ایک کے بجائے مجھے دو سولڈو دے دیتیں!''

بے وقوف عورت فاتح کے معقول فخر کو نہیں سمجھ سکی، اس نے تو بس پیپے کو گھونسا دکھا دیا۔

پیپے کی بہن جو اس سے بہت بڑی تھی لیکن اس سے زیادہ تیز طرار نہیں تھی، ایک دولت مند امریکی کے ولا میں ملازم ہو گئی۔ وہ دیکھنے میں ایک دم بالکل بدل گئی۔ وہ صاف ستھری رہنے لگی، اس کے گال گلابی ہو گئے اور اس میں اس طرح شگفتگی، گداز اور رس پیدا ہونے لگا جیسے ماہ اگست میں ناشپاتی میں ہوتا ہے۔

''کیا تم سچ مچ روز کھانا کھاتی ہو؟'' اس کے بھائی نے ایک دفعہ اس سے پوچھا۔

''اگر چاہوں تو دن میں دو تین دفعہ۔'' اس نے بڑی شان سے جواب دیا۔

''ذرا خیال رکھنا کہیں اپنے دانت نہ خراب کر لو۔'' پیپے نے نصیحت کی۔
''کیا تمہارا آقا بہت مال دار ہے؟'' اس نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

''ہاں اور کیا میرا خیال ہے کہ وہ بادشاہ سے بھی زیادہ مال دار ہے۔''
''تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں! بھلا اس کے پاس کتنی پتلونیں ہیں؟''
''مشکل ہے یہ بتانا۔''
''دس؟''
''شاید اس سے بھی زیادہ......''
''تو مجھے ایک پتلون لا دو، اس کے پائینچے بہت لمبے نہ ہوں مگر ہو سب سے زیادہ گرم۔'' پیپے نے کہا۔
''کس لیے؟''
''کس لیے؟ ذرا میری پتلون کو دیکھو!''
اور واقعی وہاں کچھ تھا ہی نہیں جسے دیکھا جائے کیونکہ پیپے کی پتلون تار تار ہو چکی تھی۔

''ہاں'' اس کی بہن نے اس سے اتفاق کیا ''واقعی تمہیں نئے کپڑوں کی ضرورت ہے! لیکن کیا وہ لوگ یہ تو نہیں سمجھیں گے کہ ہم نے پتلون چرا لی ہے؟''
''یہ مت سمجھو کہ اور لوگ ہم سے زیادہ بے وقوف ہیں!'' پیپے نے اسے اطمینان دلایا۔ ''اگر تم کسی ایسے آدمی کے پاس سے تھوڑی سی کوئی چیز لے لو جس کے پاس بہت کچھ ہے تو وہ چرانا تھوڑا ہی ہوگا، وہ تو مل جل کر چیز استعمال کرنا ہوا۔''
''تم بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو۔'' اس کی بہن نے اعتراض کیا لیکن پیپے نے جلد ہی اس کی جھجک اور تامل کو دور کر دیا اور جب وہ باورچی خانے میں ایک ہلکے خاکستری رنگ کی اچھی سی پتلون لے کر آئی جو ظاہر ہے اس کے لیے بہت بڑی تھی تو پیپے نے فوراً سمجھ لیا کہ اس دقت پر کیسے قابو پایا جائے۔

"مجھے ایک چاقو دینا!" اس نے کہا۔

دونوں نے مل کر امریکی کی پتلون کو پیپے کے لیے ایک بہت موزوں قسم کے لباس میں تبدیل کر دیا۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ ایک ڈھیلے ڈھالے، چوڑے بورے کی شکل میں سامنے آیا جو کچھ بھی ہو بے آرام نہیں تھا، وہ ڈوریوں کے ذریعے کندھوں تک پہنچ سکتی تھی اور وہ ڈوریاں گردن میں باندھی جا سکتی تھیں، پتلون کی جیبیں آستینوں کا کام دے سکتی تھیں۔

اور اگر پتلون کے مالک کی بیوی نے آ کر ان کے کام میں خلل نہ ڈال دیا ہوتا تو غالباً ایک اور بھی بہتر اور زیادہ مناسب قسم کا لباس تیار کر لیتے۔ وہ باورچی خانے میں آئی اور اس نے کئی زبانوں میں مغلظات کی بوچھار کر دی۔ اور ان میں سے ہر زبان کے الفاظ کا تلفظ غلط تھا جیسا کہ امریکی ہمیشہ ہی کرتے ہیں۔

پیپے اس زور تقریر کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکا، اس نے تیوری پر بل ڈالے، اپنا ہاتھ دل پر رکھا، بے بسی کے عالم میں اپنا سر پکڑا اور بے آواز بلند آہیں بھریں لیکن اس عورت کا غصہ دھیما نہیں پڑا، یہاں تک کہ اس کا شوہر بھی سین پر نمودار ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

اس پر پیپے بول ہی پڑا۔

"سینیور، مجھے آپ کی سینیورا کے اٹھائے ہوئے طوفان پر بے حد حیرت ہو رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کا خیال کر کے مجھے یہ بات کچھ ناگوار بھی گزری ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ سمجھ رہی ہیں کہ ہم نے پتلون کو خراب کر دیا ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ اب میرے بالکل ٹھیک آتی ہے! کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ سمجھ رہی ہوں کہ میں نے آپ کی آخری پتلون لے لی ہے اور آپ اپنے لئے دوسری پتلون خرید نہیں سکتے......"

امریکی، جو پرسکون طریقے سے اس کی تقریر کو سنتا رہا تھا، اب بولا:

"او، لڑکے، میرا خیال ہے کہ مجھے پولیس کو بلانا چاہیے۔"

''واقعی'' پیپے نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کس لیے؟''

''تمہیں جیل لے جانے کے لیے......''

پیپے کو بہت ہی دکھ پہنچا۔ اصل میں تو وہ بالکل روہانسا ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنے آنسو پی لئے اور بڑے رکھ رکھاؤ اور وقار کے ساتھ کہنے لگا:

''سینور، اگر آپ کو لوگوں کو جیل بھیج کر خوشی ہوتی ہے تو یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے! لیکن اگر میرے پاس کئی پتلونیں ہوتیں اور آپ کے پاس ایک بھی نہ ہوتی تو میں ایسا کبھی نہ کرتا! میں آپ کو دو یا شاید تین پتلونیں تک دے دیتا، اگرچہ ایک وقت میں تین پتلونیں پہننا ناممکن ہے! خاص طور پر گرمی کے موسم میں......''

امریکی قہقہہ مار کر ہنس پڑا کیونکہ کبھی کبھی امیر آدمی بھی مذاق کو سمجھ سکتے ہیں۔ پھر اس نے پیپے کو کچھ چاکلیٹ دیئے اور ایک فرانک کا ایک سکہ۔ پیپے نے سکے کو دانتوں میں دبا کر دیکھا اور یہ سکہ عطا کرنے والے کا شکریہ ادا کیا:

''شکریہ، سینور! میں سمجھتا ہوں سکہ جعلی تو نہیں ہوگا؟''

لیکن پیپے قابل دید اس وقت ہوتا جب وہ پتھروں کے درمیان کہیں اکیلا کھڑا ہوا غور و فکر کے ساتھ ان کی درزوں کا معائنہ کرتا ہے گویا چٹانی زندگی کی تاریک تاریخ پڑھ رہا ہو۔ ایسے لمحات میں اس کی روشن آنکھیں فرط حیرت سے پھیل جاتی ہیں اور ان پر ایک دھندلا سا پردہ پڑ جاتا ہے، اس کے پتلے پتلے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کا خفیف سا جھکا ہوا سر ہوا کے جھونکوں سے ہلتے ہوئے پھول کی طرح تھوڑا سا دائیں بائیں جھومتا ہوا ہوتا ہے۔ اور وہ زیر لب، آہستہ آہستہ کوئی دھن گنگناتا ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ ہی گاتا رہتا ہے۔

اور اس وقت بھی پیپے کو دیکھنا بہت خوشگوار ہوتا ہے جب وہ پھولوں کا معائنہ کرتا ہے اور وسٹیریا کے ارغوانی شگوفوں کو دیکھتا ہے، جو دیواروں پر ایک طوفان رنگ و بو برپا کئے رہتے ہیں۔ وہ وائلن کے تاروں کی طرح بالکل تنا کھچا کھڑا رہتا ہے گویا سمندری ہوا کے جھونکوں کی ہلائی ہوئی ریشمی پنکھڑیوں کے ملائم ارتعاش کو سن رہا ہو۔

وہ دیکھتا جاتا ہے اور گاتا جاتا ہے: "فیوریتو...... فیوریتو......"

اور دور سے کسی بہت بڑے طنبورے کی آواز کی طرح سمندر کی گھٹی گھٹی آہیں سنائی دیتی ہیں۔ تیتریاں پھولوں پر آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں، پیپے سر اٹھاتا ہے اور ان کو اڑتے ہوئے دیکھنے لگتا ہے اور سورج کی چمک کی وجہ سے آنکھیں جھپکاتا ہے۔ اس کے ہونٹ نیم وا ہیں اور ان پر ایک تبسم کھیل رہا ہے جس میں ذرا سے رشک اور غم کی چاشنی بھی ہے لیکن اس کے باوجود وہ دھرتی کی ایک اونچی اور اعلیٰ ہستی کا کشادہ اور فراخ تبسم ہے۔

"شو!" وہ چلاتا ہے اور ایک زمردیں چھپکلی کو ڈرانے کے لیے تالی بجاتا ہے۔

اور جب سمندر آئینے کی طرح پرسکون ہوتا ہے اور چٹانیں بڑی بڑی لہروں کے سفید، لیس دار جھاگوں سے خالی ہوتی ہیں تب پیپے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے شفاف پانی کے اس حصے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے جہاں سرخی مائل سمندری گھاس کے درمیان مچھلیاں سبک انداز میں تیرتی ہیں، جھینگا مچھلیاں ادھر سے ادھر لپکتی جھپکتی ہیں اور کیکڑا آہستہ آہستہ، آڑا آڑا تیرتا ہے۔ اور خاموشی کے درمیان لڑکے کی صاف آواز ملائم ملائم طریقے سے نیلے پانی پر بہنے لگتی ہے:

"سمندر، اوہ، سمندر......"

بڑے آدمی اکثر ناپسندیدگی سے سر ہلا کر کہتے ہیں: "یہ لڑکا نراجی بنے گا!"

لیکن نیک طبیعت لوگ جن کی قوت مشاہدہ بھی زیادہ تیز ہے اس کے متعلق کچھ اور ہی رائے رکھتے ہیں:

"پیپے ہمارا شاعر ہوگا......"

اور الماریاں بنانے والا پاسکالینو...... ایک بوڑھا شخص جس کا سر چاندی سے ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے اور جس کا چہرہ قدیم رومی سکوں پر کھدے ہوئے چہروں سے مشابہت رکھتا ہے۔ عقل مند پاسکالینو جس کی ہر شخص عزت کرتا ہے، اپنی ایک الگ ہی رائے رکھتا ہے۔

"ہمارے بچے ہم سے کہیں زیادہ اچھے ہوں گے اور ان کی زندگی بھی بہتر ہوگی!"

بہت سے لوگ اس کی بات پر یقین رکھتے تھے۔

میکسم گورکی

وحشی

جزیرہ مکمل خاموشی میں ملفوف محوِ خواب ہے۔ سمندر بھی سویا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی طاقت ور ہاتھ نے اس عجیب و غریب شکل کی سیاہ چٹان کو آسمان سے سمندر کی تہ میں پھینک دیا ہو اور اس کے اندر سے تمام زندگی نچوڑ لی ہو۔

سمندر کی اس جگہ سے جہاں کہکشاں کی سنہری محراب سیاہی مائل سمندر سے ہم آغوش ہوتی ہے جزیرے کو دیکھا جائے تو وہ ایک چپٹی پیشانی والے درندے سے مشابہ معلوم ہوتا ہے جو ساحل کے بالکل سرے پر کمر دوہری کیے دبکا ہوا بیٹھا ہو اور خاموشی سے پانی پی رہا ہو۔

دسمبر کے مہینے میں ایسی سیاہ راتیں جن میں موت کی سی خاموشی ہوتی ہے، بہت عام ہیں، یہ راتیں اتنی غیر معمولی حد تک پر سکوت ہوتی ہیں کہ آدمی سرگوشیوں کے یا زیرِ لب بات کرنے کے علاوہ اور کسی طرح بات کرتے ہوئے جھجکتا ہے کہ کہیں کوئی اونچی آواز رات کے آسمان کے نیلگوں مخمل کے نیچے اس پتھریلی خاموشی میں ابھرتی ہوتی کسی پر اسرار چیز کے سکون کو درہم برہم نہ کر دے۔

ساحل پر بکھری ہوئی چٹانوں کے درمیان بیٹھے ہوئے دو آدمی سرگوشیوں میں گفتگو کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک چنگی کا سپاہی ہے جو ایک زرد گوٹ والی سیاہی مائل وردی میں ملبوس ہے اور اس کی پشت پر ایک چھوٹی رائفل لٹکی ہوئی ہے۔ وہ یہاں

اس لیے ہے کہ کسانوں اور مچھیروں کو چٹانوں کی درزوں میں جما ہوا نمک جمع نہ کرنے دے۔ دوسرا ایک بوڑھا مچھیرا ہے، ہسپانویوں کی طرح ڈاڑھی مونچھ صاف، سانولا رنگ، نقرئی گل مچھے اور طوطے کی سی لمبی اور چوپچیلی ناک۔

چٹانیں چاندی سے ڈھلی ہوئی معلوم ہوئی ہیں جسے کھاری پانی نے تھوڑا سا زنگ آلود کر دیا ہو۔

سپاہی جوان آدمی ہے اور اسی وجہ سے ظاہر ہے وہ اس موضوع پر بات کر رہا ہے جو اس کے نوجوان دل سے قریب ترین ہے۔ بوڑھا کاہلی سے اور کبھی کبھی درشتی سے جواب دیتا ہے:

''دسمبر میں بھلا کون محبت کرتا ہے؟'' وہ کہتا ہے ''اس مہینے میں تو بچے پیدا ہوتے ہیں......''

''بکواس! جب انسان جوان ہوتا ہے تو وہ ٹھیر نہیں سکتا......''

''نہیں ٹھیرتا تو ٹھیرنا چاہیئے۔''

''تم ٹھیرے تھے؟''

''میرے دوست، میں سپاہی نہیں تھا۔ میں کام کرتا تھا اور میں نے اپنے وقت میں ہر اس چیز کا تجربہ حاصل کیا جس کا ہر آدمی کو تجربہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔''

''میں نہیں سمجھا۔''

''ایک دن تم سمجھ جاؤ گے۔''

ساحل سے نزدیک ہی نیلا شعرائے یمانی پانی میں اپنا عکس ڈالتا ہے۔ اگر آپ کافی دیر تک اس مدہم روشنی پر نظر جمائے رکھیں تو آپ کو پانی پر ایک ہیراک پیپا نظر آئے گا جو آدمی کے سر کی طرح گول اور بالکل بے حس وحرکت ہے۔

''تم سو کیوں نہیں رہے؟''

بوڑھا اپنے بدرنگ سے لبادے کو کھول ڈالتا ہے اور کھانس کر جواب دیتا ہے:

''ہم نے یہاں اپنے جال ڈال رکھے ہیں۔ ہیراک پیپا دیکھتے ہو؟''

"ہاں، اب نظر آنے لگا۔"

"تین دن ہوئے ایک جال پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔"

"ڈولفن؟"

"جاڑے میں؟ نہیں۔ شاید شارک۔ کون جانے؟"

ایک چھوٹا سا پتھر کسی نظر نہ آتے ہوئے جانور کے پاؤں سے لڑھک کر سوکھی گھاس میں سے ہوتا ہوا پہاڑی کی ڈھلان سے سمندر میں جا گرا اور اس سے خوب چھپ چھپ کی آواز پیدا ہوئی۔ خاموش رات بڑے ذوق وشوق سے اس وقتی شور پر جھپٹ پڑی اور بہت محبت بھرے انداز میں اپنی گہرائیوں کے اندر سے اس کی صدائے بازگشت نکالی، جیسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی یاد کو سینے سے لگا کر رکھنے کی آرزومند ہو۔

سپاہی نے دھیرے دھیرے ایک مزاحیہ گیت گانا شروع کر دیا۔

بوڑھوں کی نیند اچھی کیوں نہیں ہوتی؟
امبرڈو تم بتا سکتے ہو کہ کیوں؟
کیونکہ اپنے عہد شباب میں
انہوں نے شراب بہت کثرت سے پی ہے......

"یہ میرا ذکر نہیں ہے۔" بوڑھے نے غرا کر کہا۔

اور کس وجہ سے بوڑھوں کی نیند خراب ہوتی ہے؟
عقل مند پرگیتو، تمہیں کچھ بتاؤ؟
کیونکہ جب وہ جوان تھے
اس وقت انہوں نے کافی پیار نہیں کیا۔

"اچھا گیت ہے نا، چچا پاشکالے؟"

"جب تم ساٹھ برس سے زیادہ عمر کو پہنچو گے تو تمہیں اس کا جواب خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

بہت دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے اور ان کی یہ خاموشی اس دنیا سے ہم آہنگ تھی جس کے منہ پر رات نے مہر لگا دی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد بوڑھے نے اپنے منہ سے پائپ نکالا۔ اس کو ایک پتھر پر مارنے لگا اور اس کی آواز کو سنتے ہوئے بولا:

''تم نوجوان ہنستے تو خوب ہو لیکن مجھے یقین نہیں کہ تم محبت کرنا اتنی اچھی طرح جانتے ہو نگے جتنی اچھی طرح اگلے وقتوں کے لوگ کرتے تھے۔''

''ہوں! وہی پرانی کہانی...... محبت ہمیشہ ایک ہی طرح کی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے......''

''تمہارا خیال ہے! لیکن تم جانتے نہیں ہو۔ ادھر پہاڑی کے پیچھے سزاما نے خاندان رہتا ہے۔ ان سے کہوں تمہیں کارلو بابا کی کہانی سنائیں۔ تمہاری بیوی کے لیے سودمند ہوگی۔''

''میں اجنبیوں سے کیوں کہوں جبکہ تم خود ہی مجھے یہ کہانی سنا سکتے ہو؟''

کہیں ایک رات کا پرندہ اڑا جو نظر نہیں آ رہا تھا اور ایک عجیب سی آواز نے ہوا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ جیسے سوکھی چٹانوں کو ایک اونی کپڑے سے رگڑا جا رہا ہو۔

تاریکی زیادہ گہری، گرم اور سیلی ہو گئی، آسمان دور معلوم ہونے لگا اور کہکشاں کے نقرئی دھند لکے میں ستارے بڑھتی ہوئی تابانی کے ساتھ چمکنے لگے۔

''پرانے وقتوں میں عورتوں کی زیادہ قدر کی جاتی تھی......''

''واقعی؟ مجھے یہ نہیں معلوم تھا!''

''مرد لوگ اکثر لڑائیوں پر جاتے رہتے تھے......''

''ہاں اور بیواؤں کی تعداد بہت بڑی تھی......''

''ہمیشہ بحری قزاق اور سپاہی۔ اور لگ بھگ ہر پانچ سال کے بعد نیپلس میں نئے نئے حاکم پیدا ہو جاتے تھے۔ عورتوں کو مقفل کر کے رکھنا پڑتا تھا۔''

''آج کل بھی ایسا ہی کیا جائے تو کچھ برا نہ رہے......''

''مرغیوں کی طرح انہیں چرا لیا جاتا تھا......''

''مجھ سے پوچھو تو لومڑیوں کی طرح......''

بوڑھا خاموش ہو گیا اور اس نے اپنا پائپ سلگا لیا۔ سفید، خوشبودار دھوئیں کا ایک بادل سا ساکن ہوا میں معلق ہو گیا۔ دیا سلائی چمکی اور اس نے سانولی، چونچیلی ناک اور اس کے نیچے کی خشخشی مونچھوں کو روشن کر دیا۔

''اچھا، پھر کیا ہوا؟'' سپاہی نے خواب آلود انداز میں دریافت کیا۔

''اگر قصہ سننا چاہتے ہو تو خاموش رہو۔''

شعرائے یمانی اتنی تیزی سے چمک رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا یہ مغرور ستارہ آب وتاب کے لحاظ سے اور تمام اجسام فلکی سے بازی لے جانے کا خواہش مند ہے۔ سمندر پر طلائی سفوف بکھرا ہوا تھا اور آسمان کے اس خفیف سے نظر آنے والے عکس نے اس سیاہ اور پر سکوت کھلی فضا میں ذرا جان سی ڈال دی تھی اور اسے ایک ٹمٹماتی ہوئی جوت اور چمک بخش دی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سمندر کی گہرائیوں میں سے ہزاروں ضوفگن آنکھیں چمک رہی ہوں......

''میں سن رہا ہوں'' سپاہی نے بے صبری سے کہا۔ مچھیرے کی خاموشی سے اسے کچھ دکھ سا ہوا تھا۔ بوڑھے نے پھر ایک ایسی داستان کا تانا بانا بننا شروع کر دیا جس کی سی داستانیں ہمیشہ دل چسپی کے ساتھ سنی جائیں گی۔

''کوئی سو سال پہلے کی بات ہے اس پہاڑ کے اوپر اس جگہ جہاں صنوبر کے درخت اگتے ہیں، ایک بوڑھا اور کبڑا ایوتانی رہا کرتا تھا۔ اس کا نام ایکیلانی تھا اور وہ ایک محصول چور تھا جو جادو ٹونے کرنے والا کہا جاتا تھا۔ اس ایکیلانی کے ایک بیٹا تھا آریس تیدلیس نامی۔ وہ شکاری تھا کیونکہ اس زمانے تک جنگلی بکریاں پہاڑی جنگلوں میں گھومتی پھرتی تھیں۔ اس زمانے میں سب سے زیادہ دولت مند خاندان گیلی آرڈیوں کا تھا۔ آج کل وہ اپنے دادا کا نام، سنزا مانے، استعمال کرتے ہیں۔ انگور کے باغوں کا آدھا حصہ ان کی ملکیت تھا اور وہ شراب کے آٹھ تہ خانوں کے مالک تھے جن میں ہزار سے اوپر پیپے تھے۔ ان دنوں ہماری سفید شراب فرانس تک میں بہت ہی عمدہ سمجھی جاتی

تھی جہاں میں نے سنا ہے لوگ شراب کے علاوہ اور کسی چیز کی قدر و قیمت جانتے ہی نہیں۔فرانسیسی سب جواری اور شرابی ہوتے ہیں، انہوں نے تو اپنے بادشاہ کا سر تک جوئے میں شیطان کے ہاتھ ہار دیا تھا۔"

سپاہی آہستہ سے ہنسا اور کہیں قریب ہی چھپ چھپ کی آواز پیدا ہوئی گویا اس کی ہنسی کی صدائے بازگشت ہو۔ان دونوں کے کان کھڑے ہو گئے اور انہوں نے غور سے سمندر کے اس حصے کو دیکھا جہاں ہلکی ہلکی لہریں ساحل سے لوٹ رہی تھیں۔

"یہ مچھلیاں کانٹوں کو کتر رہی ہیں۔"

"کہانی کہے جاؤ......"

"ہاں...... گیلی آرڈی۔وہ تین بھائی تھے۔میری کہانی منجھلے بھائی کے متعلق ہے۔اسے کارلو نے کہا جاتا تھا کیونکہ اس کا دہن بہت بڑا اور آواز بہت گونج دار تھی۔ اس کا لوہار کی غریب لڑکی ژولیا پر دل آگیا تھا جو ایک سمجھدار لڑکی تھی۔کسی نہ کسی وجہ سے ان کی شادی ملتوی ہو گئی اور وہ بڑی بے صبری سے اپنے بیاہ کے دن کا انتظار کرنے لگے۔اس عرصے میں یونانی کا بیٹا، جس کی خود بھی ژولیا پر نظر تھی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھا رہا۔بہت دن اس نے ژولیا کی محبت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ژولیا نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔سو اس نے ژولیا کو بدنام کرنے کا تہیہ کر لیا۔کیونکہ اسے امید تھی کہ اس طرح کارلو نے گیلی آرڈی اسے ٹھکرا دے گا اور پھر وہ خود آسانی سے اسے حاصل کر سکے گا۔اس زمانے میں لوگ اب سے زیادہ سخت تھے......"

"مگر اب بھی......"

"بدچلنی کی زندگی بے کار امیروں کی تفریح اور دل بہلاوا ہے، اور یہاں ہم سب غریب لوگ ہیں۔" بوڑھے نے سختی سے کہا اور ماضی کی طرف لوٹ کر اپنی کہانی جاری رکھی:

"ایک دن جب وہ لڑکی انگور کی بیلوں کی کٹی ہوئی شاخیں جمع کر رہی تھی تو یونانی کا لڑکا اس کے قریب آیا اور یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ پہاڑی تنگ ڈنڈی پر اس کا

پاؤں پھسل گیا ہے، وہ لڑکھڑا کر دھم سے عین ژولیا کے قدموں کے پاس گر پڑا۔ ژولیا جو ایک اچھی عیسائی تھی، گھٹنوں کے بل جھک کر یہ دیکھنے لگی کہ اس کو چوٹ تو نہیں لگی۔ وہ کراہا۔

''ژولیا'' اس نے منت سے کہا ''میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ کسی کو مدد کے لیے مت پکارو۔ اگر تمہارا رشک کے جذبے سے بھرپور منگیتر مجھے یہاں تمہارے پاس دیکھے گا تو جان ہی سے مار ڈالے گا۔ مجھے یہاں ذرا دیر آرام کرنے دو اور پھر میں چلا جاؤں گا......''

اپنا سر اس کے گھٹنے پر رکھ کر اس نے بے ہوشی کا بہانہ کر لیا۔ سہمی ہوئی لڑکی نے مدد کے لیے لوگوں کو پکارا لیکن جب لوگ دوڑے تو وہ لڑکا یکبارگی اچھل کر کھڑا ہو گیا، بالکل ہٹا کٹا، چاق چوبند، اور اس نے اس طرح کی حرکتیں شروع کر دیں جن سے معلوم ہو کہ اسے کچھ شرم آ رہی ہے اور ژولیا کے لیے زور شور سے اظہار محبت کرنے لگا اور کہنے لگا کہ اس سے شادی کر لے گا۔ قصہ مختصر یہ کہ اس نے ایسا ظاہر کیا گویا وہ ژولیا کے بوس و کنار سے تھک کر اس کی آغوش میں سو گیا تھا۔ باتوں میں آ جانے والے سادہ لوح لوگوں نے لڑکی کے غصہ بھرے انکار کے باوجود اس بات کا یقین کر لیا۔ وہ یہ بھول گئے کہ اس نے خود ہی لوگوں کو مدد کے لیے بلایا تھا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ یونانی فطرتاً چالاک ہوتا ہے اور خود شیطان یونانیوں کو پتہ دیتا ہے تاکہ عیسائیوں کے لیے پراگندگی اور گڑبڑ پیدا کر سکے۔ لڑکی نے قسم کھا کر کہا کہ یونانی جھوٹ بولتا ہے لیکن یونانی نے کہا کہ اصل میں اسے سچ سچ قبول کرتے ہوئے شرم آ رہی ہے اور وہ کارلو نے کے انتقام سے ڈرتی ہے۔ اس نے لوگوں کو قائل کر لیا لیکن لڑکی بالکل دیوانی ہو گئی۔ وہ ہاتھوں میں پتھر لے کر لوگوں پر جھپٹ پڑی، لہٰذا اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دئے گئے اور وہ سب شہر کی طرف چل پڑے۔ اس وقت تک کارلو نے نے ژولیا کی چیخیں سن لی تھیں اور وہ اس کے پاس جانے کے لیے دوڑ پڑا تھا لیکن جب لوگوں نے اسے بتایا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا تو وہ مجمع کے سامنے گھٹنوں کے بل گر پڑا، پھر ایک دم اچھل کر کھڑا

ہوا اور اپنے بائیں ہاتھ سے اس نے اپنی محبوبہ کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مارا اور دائیں ہاتھ سے یونانی کا گلا گھونٹنے لگا۔ بڑی مشکل سے لوگوں نے اسے الگ کیا۔

''وہ احمق تھا'' سپاہی غرایا۔

''ایک ایماندار شخص کی عقل اس کے دل میں ہوتی ہے! میں نے تمہیں بتایا ہے کہ یہ سب جاڑے کے موسم میں ہوا۔ یسوع کی ولادت کے جشن سے چند ہی روز پہلے۔ اس دن لوگ ایک دوسرے کو اپنی زائد شراب اور پھل، مچھلی اور مرغی کے تحفے پیش کرتے ہیں۔ سب ہی کچھ نہ کچھ دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ سب سے زیادہ غریب لوگوں کو سب سے زیادہ ملتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کارلو نے کو سچی بات کس طرح معلوم ہوئی لیکن اسے معلوم ہوگیا کہ اصل میں کیا واقعہ ہوا تھا۔ اور جشن کے پہلے دن ژولیا کے والدین کو، جنہوں نے چرچ تک جانے کے لیے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا، صرف ایک تحفہ ملا۔ صنوبر کی شاخوں سے بنی ہوئی ایک چھوٹی سی ٹوکری اور اس میں ......کارلو نے گیلی آرڈی کا بایاں ہاتھ...... وہ ہاتھ جس نے ژولیا کو مارا تھا۔ وہ لوگ دہشت کے عالم میں دوڑتے ہوئے اس کے گھر گئے اور کارلو نے نے اپنے گھر کی چوکھٹ پر دوزانو جھکے ہوئے ان کا سواگت کیا۔ اس کے بازو کے ٹھنٹھ پر ایک خون بھری پٹی لپٹی ہوئی تھی اور وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

''یہ تم نے کیا کر ڈالا؟'' انہوں نے اس سے پوچھا۔

اور اس نے جواب دیا: ''میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا'': جس شخص نے میری محبت کی توہین کی زندہ نہیں رہ سکتا تھا سو میں نے اسے مار ڈالا۔ اور جس ہاتھ نے میری پاک دامن محبوبہ کو مارا، میرا گناہ گار ہے، سو میں نے اسے کاٹ ڈالا...... ژولیا اب میری تم سے ایک درخواست ہے۔ وہ یہ کہ تم اور تمہارے ماں باپ مجھے معاف کر دیں......''

''ظاہر ہے انہوں نے اسے معاف کر دیا لیکن ابھی تک ایسے قانون موجود ہیں جو بدمعاشوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ گیلی آرڈی کو اس یونانی کے قتل کے جرم میں

دو سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا اور اس کے بھائیوں کو اسے جیل سے نکالنے میں بہت پیسہ صرف کرنا پڑا......''

''بعد میں اس نے ژولیا سے شادی کر لی اور وہ بہت بڑی عمر تک ہنسی خوشی ایک ساتھ رہتے رہے اور وہ اپنے ساتھ اس جزیرے کے لیے ایک نیا نام، سنز امانے بے ہاتھ کا...... لے کر آئے۔''

بوڑھا خاموش ہو گیا اور زور زور اپنے پائپ کو چوسنے لگا۔

''مجھے یہ کہانی پسند نہیں آئی۔'' سپاہی نے کہا ''وہ تمہارا کارلو نے بالکل وحشی تھا۔ اور مجموعی طور پر یہ سب حماقت کی باتیں تھیں۔''

''اب سے سو سال بعد لوگوں کو تمہاری زندگی بھی احمقانہ معلوم ہوگی۔'' بوڑھے نے سنجیدگی سے کہا اور سفید دھوئیں کا ایک بادل نکالتے ہوئے اٹھا اور کہا: ''اور وہ بھی اس صورت میں کہ کسی کو اتنا یاد رہ گیا کہ تم بھی کبھی اس دھرتی پر رہتے تھے......''

ایک دفعہ پھر ایک زور کے چھپاکے نے سکوت کو توڑا۔ اس دفعہ زوردار اور تیز تھا۔ بوڑھے نے اپنا لبادہ اتارا، تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا جیسے سیاہی مائل پانی نے اسے نگل لیا ہو جو بالکل پر سکوت بھی تھا...... سوائے مچھلی کے نقرئی پروں کی طرح نیلگوں ہلکے ہلکے ہلکوروں کے جو ساحل کے قریب اٹھ رہے تھے۔

ملائم کہانی

بالکل بچپن ہی سے بوڑھا گیووانی سمندر کو دل دے بیٹھا تھا......اس نیلگوں وسعت کو جو کبھی ایک نوخیز لڑکی کی نگاہوں کی طرح ملائم اور پر سکون ہوتی ہے تو کبھی ایک عورت کے پر جوش، آشنائے جذبہ دل کی مانند طوفانی، اس صحرا کو جو اس تمام دھوپ کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے جس کی مچھلیوں کو ضرورت نہیں ہوتی اور جو سورج کی سنہری کرنوں سے ہم آغوش ہو کر صرف حسن اور خیرہ کن تابندگی ہی کی تخلیق کرتا ہے، اس دغا باز سمندر کو جو اپنے ابدی گیت کے ذریعے انسان کے دل میں اپنے دور دراز فاصلوں تک پہنچنے کی بے تاب تمنا جگا دیتا ہے۔ گونگی پتھریلی زمین سے، جو آسمان سے اتنی زیادہ نمی کی اور انسان سے اتنی زیادہ محنت اور مشقت کی طالب رہتی ہے اور جو بدلے میں اتنی کم مسرت دیتی ہے، سمندر نے بہت سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ بلایا ہے!

جب ٹوبا لڑکپن میں ان انگوروں کی بیلوں پر کام کرتا تھا جو ڈھلانوں پر اگی ہوئی، پہاڑ کے دامن سے چمٹی رہتی تھیں اور جنھیں بھورے پتھروں کی دیواروں نے سہارا دے رکھا تھا، اور جب وہ پھیلے ہوئے انجیر کے درختوں، دھات کے پتروں جیسے پتوں والے زیتون کے درختوں، گہرے سبز رنگ کے نارنگی کے درختوں اور آپس میں گتھی ہوئی شاخوں والے انار کے درختوں کے درمیان کام کرتا تھا، جب وہ تابندہ سورج کے نیچے تپتی ہوئی زمین پر پھولوں کی خوشبو میں کام کرتا تھا اس وقت بھی ٹوبا ندیدے پن

سے نیلے سمندر کو تکتا تھا اور اس کی آنکھیں ایک ایسے شخص کی آنکھیں تھیں جس کے پاؤں تلے زمین ہلتی اور ڈولتی تھی۔ وہ سمندر کو تکتا رہتا تھا یہاں تک کہ اس کی باد پیمائی بادہ نوشی بن جاتی تھی، اور وہ بھولا بھولا، مٹھا اور اپنے کہنے کا ہو جاتا تھا، جیسا کہ وہ لوگ ہمیشہ ہی ہو جاتے ہیں جن پر سمندر کا جادو چل جاتا ہے جو بری طرح سمندر کو دل دے بیٹھتے ہیں......

اور چھٹی کے دنوں میں صبح سویرے، جب سورج اپنی پہلی جھلک دکھاتا تھا اور سوریشو کے اوپر کا آسمان ابھی گلابی ہی ہوتا تھا، گویا اسے خوبانی کے شگوفوں سے بنا گیا ہو، نوجوان ٹوبا، گڈریے کے کتے کی طرح جھبرا، اپنی بنسی کا نٹا کندھے پر ڈال کر پہاڑی کی ڈھلانوں پر دوڑ پڑتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں ہڈی کا نام بھی نہیں ہے اور وہ محض لچکیلے پٹھوں سے بنا ہوا ہے۔ وہ ایک چٹان سے دوسری پر کودتا پھاندتا نیچے سمندر کی طرف پہنچ جاتا تھا۔ اور جب سمندر کی تیز بو، جو جاگتے ہوئے پھولوں کی میٹھی نکہت سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے، صبح کی تازہ ہوا کے شانوں پر سوار اس کی طرف بہتی تھی اور وہ نیچے کے پتھروں سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی موجوں کی ہلکی ہلکی سرگوشیاں سنتا تھا، جو کنواری کنیاؤں کی طرح اسے اپنی طرف کھینچتی تھیں، تو اس کا چوڑا، تلوں سے بھرا ہوا چہرہ ایک مسرت بھری مسکراہٹ سے دمک اٹھتا تھا......

وہ وہاں ایک گلابی مائل بھوری چٹان پر بیٹھا ہوا ہے، اس کی سنولائی ہوئی ٹانگیں نیچے جھول رہی ہیں، اس کی آلوچوں کی سی، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں شفاف، سبزی مائل پانی کو غور سے دیکھ رہی ہیں جس کا سیال شیشہ اس کی نظروں کے سامنے اس کی سنی ہوئی تمام پریوں کی داستانوں سے زیادہ دلکش، زیادہ محسوس کن دنیائے عجائبات کا پردہ کھول دیتا ہے: سمندر کی تہ میں قالینوں سے ڈھکے ہوئے پتھروں کے درمیان لہراتی ہوئی۔ سرخی مائل بحری گھاس، شوخ رنگوں والے ''ویولی'' بحری گھاس کے جنگل سے باہر کی طرف بہتے ہوئے سمندری پھول، شرابیوں کی سی دھندلائی ہوئی آنکھوں، دھاری دار ناکوں اور نیلی چتیوں والے پیٹوں کی ''پرکی''، سنہری ''سارپی''، دھاری دار، بے باک ''بینی''، زندہ دل شیطانوں کی طرح ادھر سے ادھر، لپکتی چھپکتی سیاہ ''گوارا چینی''، ''سپارا

گلیونی''، نقرئی طشتریوں کی طرح چمکتی ہوئی ''اوکیات'' اور ان کے علاوہ دوسری متعدد خوبصورت مچھلیاں...... جو سب کی سب بڑی چالاک ہوتی ہیں اور کانٹے پر لگے ہوئے چارے کو تیزی سے اپنے ننھے منے گول گول منہ میں لینے سے پہلے اپنے چھوٹے چھوٹے دانتوں سے ذرا ذرا سا کترتی ہیں۔

اس روشن اور پرسکون پانی میں مونچھیل جھینگے اس طرح بہتے ہیں جیسے ہوا میں پرندے اڑتے ہوں، تارک الدنیا کیکڑے اپنے مرصع سیپی کے گھروں کو اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے سمندر کی تہ میں پتھروں پر رینگتے ہیں، خون کی طرح سرخ ستارہ مچھلی اپنے آپ کو آہستہ آہستہ آگے دھکیلتی ہے، ارغوانی رنگ کی میڈوسا خاموشی سے جھولا جھولتی ہیں اور کبھی کبھی تیز دانتوں والے مورائینا کا سر کسی پتھر کے نیچے سے نکل آتا ہے، اور اس کا سرخ، چتیوں دار، سانپ کا سا جسم ادھر ادھر بل کھانے لگتا ہے۔ بالکل پریوں کی داستانوں کی جادوگرنی کی طرح، مگر اس سے بھی بہت زیادہ خوفناک اور کریہہ المنظر طریقے سے۔ اور ایک دم ایک ملیالا اوکٹوپس[1] ایک میلے چیتھڑے کی طرح اپنے جسم کو پانی میں پھیلا لیتا ہے اور جلدی سے کسی شکار کے تعاقب میں لپک جاتا ہے، اور اب ایک جھینگا مچھلی آتی ہے اور اس کے بانس کی بنی ہوئی بنسی کے برابر لمبے گل مچھے اس کے جسم کی حرکت کے ساتھ ساتھ پھڑکتے جاتے ہیں۔ یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سی حیرت انگیز مخلوق اس شفاف پانی میں، ایک سمندر کے سے صاف اور روشن لیکن سمندر سے بہت زیادہ خالی آسمان کے نیچے رہتی ہے۔

اور سمندر سانس لیتا ہے اور اس کے نیلے سینے میں زیر و بم پیدا ہوتا ہے۔ سفید کناروں والی سبز موجیں اس چٹان سے ٹکراتی ہیں جس پر ٹوبا بیٹھا ہے اور اس کے پاؤں کو چومنے کی کوشش میں بڑے مگن اور مسرور انداز میں ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے ٹوبا چونک پڑتا ہے اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل جاتی ہے اور پھر وہ بھی چونچالی سے ہنستی ہیں اور گویا خوفزدہ ہو کر چٹان سے دور بھاگ جاتی ہیں مگر دوسرے ہی لمحے ہلکورے پیدا کرتی

ہوئی پھر ادھر آلیتی ہیں۔ سورج کی ایک کرن پانی کے بالکل اندر تک گھس جاتی ہے جس کی وجہ سے سمندر کے سینے میں گھسا ہوا تیز روشنی کا ایک قیف سا بن جاتا ہے۔ ٹوبا کی روح سکون اور طمانیت کے ساتھ محو خواب ہو جاتی ہے، اس وقت وہ غور و فکر اور خواہشات سے خالی ہوتی ہے اور خاموشی سے اپنی نظروں کے سامنے کے منظر سے آنکھیں سینکنے کو کافی سمجھتی ہے۔ تابندہ موجیں اس کے پورے وجود پر ہلکورے پیدا کر دیتی ہیں اور اس کی روح سمندر ہی جتنی بے پایاں آزادی کی حامل ہو جاتی ہے۔

اس طرح گزارتا تھا وہ اپنے سارے چھٹی کے دن اور کچھ عرصے بعد سمندر نے کام کے دنوں میں بھی اسے آوازیں دینی شروع کر دیں کیونکہ جب ایک دفعہ سمندر کسی شخص کا من موہنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ شخص اسی طرح سمندر کا جزو بن جاتا ہے جس طرح دل انسان کا جزو ہوتا ہے۔ سو ٹوبا نے اپنے زمین کے قطعے کو خیر باد کہہ کر اسے اپنے بھائی کے حوالے کیا اور خود دوسرے ایسے لوگوں کے ساتھ جو اسی کی طرح سمندر کے دیوانے تھے، سسلی کے ساحلوں پر مونگے تلاش کرنے چل پڑا۔ کام یہ اچھا ہے لیکن خطرناک بھی ہے کیونکہ آدمی دن میں دس مرتبہ ڈوب سکتا ہے۔ لیکن جب نیلے پانی میں سے جال بوجھل سے انداز میں اوپر اٹھتا ہے تو آدمی کیا کیا نادر چیزیں دیکھتا ہے۔ وہ ایک نیم دائرے کی شکل کا جال ہوتا ہے اور اس کے کناروں پر آہنی دانت لگے ہوتے ہیں جو انسانی دماغ کے خیالات کی طرح ہر قسم کے رنگوں سے بھرپور ہوتے ہیں اور جن میں ہر نوع کی زندگی تڑپتی ہے اور اس کے بیچوں بیچ بیش قیمت مونگوں کی گلابی گلابی شاخیں...... انسان کے لیے سمندر کا تحفہ!

سو اس طرح یہ شخص جس پر سمندر نے جادو کر دیا تھا ہمیشہ کے لیے دھرتی کے واسطے ختم ہو گیا۔ عورتوں سے بھی وہ کچھ خواب کی سی کیفیت میں پریم کرتا تھا، مختصر سے عرصے کے لیے اور خاموشی کے ساتھ، کیونکہ وہ ان سے بھی صرف انہیں چیزوں کی باتیں کر سکتا تھا جن سے وہ واقف تھا...... مچھلیوں اور مونگوں کی، موجوں کی اٹکھیلیوں کی، ہوا کے تلون اور من موجی پن کی اور ان جانے سمندروں پر چلنے والے بڑے بڑے جہازوں کی۔ خشکی پر وہ دبا سکڑا سا رہتا تھا، وہ دھرتی پر پھونک پھونک کے قدم رکھتا تھا

گویا ہر چیز پر شک و شبہ کر رہا ہو، اور لوگوں کے ساتھ وہ خاموش رہتا تھا اور انہیں متلاشی سے انداز میں ایک ایسے شخص کی سی تیزی نگاہی کے ساتھ دیکھتا تھا جو دھوکہ باز سمندری گہرائیوں کا بغور جائزہ لینے اور ان پر بھروسہ نہ کرنے کا عادی ہو۔ لیکن سمندر پر وہ خاموش اور پرسکون طریقے سے خوش رہتا تھا، اپنے ساتھیوں کا بہت خیال کرتا تھا اور ایک ڈولفن کی طرح پھرتیلا اور چاق و چوبند تھا۔

لیکن آدمی اپنے لیے چاہے جتنی اچھی زندگی منتخب کرے وہ چند بیس برسوں سے زیادہ قائم نہیں رہتی۔ جب بوڑھا سمندر کے پانی میں رہتا ہوا اسی سال کی عمر کو پہنچا تو اس کے گٹھیا کے مارے ہوئے ہاتھوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ بس بہت ہو گیا! اب اس کی گانٹھوں دار ٹانگیں مشکل ہی سے اس کے جھکے ہوئے جسم کا بار سہار سکتی تھیں، سوٹوبا جو ہر طرح کے سرد و گرم دیکھنے کے بعد اب ایک خستہ و ماندہ بوڑھا شخص تھا، افسوس اور رنج کے ساتھ اپنے جزیرے میں آیا اور پہاڑی پر چڑھ کر اپنے بھائی کی جھونپڑی پر پہنچا تاکہ وہاں اپنے بھائی کی اولاد اور پوتے نواسیوں کے ساتھ زندگی گزارے...... ان لوگوں کے ساتھ جو اپنی غربت کے باعث اب ٹوبا کے ساتھ مہربانی سے پیش نہیں آسکتے تھے جبکہ وہ پہلے کی طرح ان کو مزیدار مچھلیاں لا لا کر نہیں دے سکتا تھا۔

بوڑھا ان لوگوں کے درمیان بہت دکھی تھا، وہ اس کے نوالے گنتے تھے، روٹی کا ہر وہ ٹکڑا جو وہ اپنے مڑے ہوئے، ناتواں ہاتھوں سے اپنے پوپلے منہ میں ڈالتا تھا ان کی پرغور نگاہوں سے نہیں بچ سکتا تھا۔ اسے جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ وہاں ناخواندہ مہمان ہے۔ اس کی روح تاریک ہو گئی، اس کے دل میں شدت درد سے ایک مسوس سی اٹھنے لگی، اس کی دھوپ میں سوکھی ہوئی کھال کی جھریاں اور بھی گہری ہو گئیں اور اس کی بوڑھی ہڈیوں کو ایک نئی قسم کا درد سخت اذیت پہنچانے لگا۔ دن بھر صبح سے شام تک وہ جھونپڑی کے دروازے کے قریب پتھروں پر بیٹھا رہتا تھا، اس کی بوڑھی آنکھیں اس روشن سمندر کو تکتی رہتی تھیں جہاں اس کی شمع زندگی پگھلتی رہی تھی اور نیلا سمندر سورج کی روشنی میں تابندہ اور فروزاں خواب کی طرح حسین معلوم ہوتا تھا۔

سمندر اس سے بہت دور تھا اور ایک بوڑھے آدمی کے لیے اترائی پر سے ہو کر سمندر پر جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن اس نے تہیہ کر لیا اور ایک خاموش سی رات میں وہ پہاڑی کی اترائی پر چل پڑا، وہ ایک کچلی ہوئی چھپکلی کی طرح تیز پتھروں پر رینگ رینگ کر چل رہا تھا اور جب وہ موجوں کے قریب پہنچا اور انھوں نے اپنی اسی جانی پہچانی آواز کے ساتھ جو انسانی آواز سے کہیں زیادہ نرم اور ملائم ہوتی ہے۔ موجوں کے دھرتی کے مردہ پتھروں سے ٹکرانے کی آواز کے ساتھ اس کا سواگت کیا اس وقت، جیسا کہ لوگوں نے بعد میں قیاس آرائی کی، بوڑھا گھٹنوں کے بل گر پڑا، آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور سب لوگوں کے لیے جو اس کے لیے اجنبی تھے، تھوڑی دیر دعا مانگی اور پھر اس نے ان پرانے چیتھڑوں کو جو اس کی بوڑھی ہڈیوں کو ڈھانپے ہوئے تھے اتار کر پھینک دیا اور اپنے بوڑھے جسم کو...... جو اس کا تھا بھی اور نہیں بھی تھا...... چٹانوں پر ڈال دیا اور پانی کے اندر بڑھنے لگا۔ پھر اپنے سفید سر کو جھٹکا دے کر وہ پیٹھ کے بل لیٹ گیا اور اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے وہ تیرتا ہوا دور تک چلا گیا، وہاں تک جہاں سمندر کی گہری نیلاہٹ موجوں کو اپنے ارغوانی لبادے کے سروں سے چھوتی ہے اور ستارے پانی سے اس قدر نزدیک ہوتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے آدمی ہاتھ بڑھا کر انہیں چھو سکتا ہے

گرمی کی خاموش راتوں میں سمندر ایک دن بھر کے کھیل کود سے تھکے ہوئے بچے کی روح کی طرح پرسکون ہوتا ہے، وہ ہلکے ہلکے سانس لیتا ہوا سوتا رہتا ہے اور یقیناً بڑے اچھے اور روشن خواب دیکھتا ہے۔ اگر آدمی رات کے وقت گرم اور گاڑھے پانی میں تیرے تو اس کے ہاتھوں کے نیچے نیلگوں چنگاریاں جگمگا اٹھتی ہیں، ایک نیلا سا شعلہ اس کے چاروں طرف پھیل جاتا ہے اور اس کی روح دھیرے دھیرے اس نرم نرم آگ میں پگھلنے لگتی ہے جو ایک ماں کی سنائی ہوئی کہانی کی طرح ملائم اور منوہر ہوتی ہے۔

میکسم گورکی

انوکھی تخلیق

دن گرم ہے، ہر طرف سکوت کا دور دورہ ہے، زندگی ایک پر نور سکون و طمانیت کی آغوش میں آرام کر رہی ہے، نیلا آسمان محبت بھری نگاہوں سے زمین کو دیکھ رہا ہے، سورج گویا آسمان کی آتشیں پتلی ہے۔

سمندر نیلگوں دھات کی ایک ہموار اور چکنی چادر کی مانند ہے۔ مچھلی پکڑنے والی رنگا رنگ کشتیاں اتنی ہی حس و حرکت کھڑی ہیں گویا وہ آسمان کی مانند شفاف اور چمکیلی کھاڑی کے نیم دائرے میں جڑ دی گئی ہوں۔ ایک بحری بگلا کاہلی سے اپنے پر پھڑ پھڑاتا ہوا اڑتا ہے اور پانی کی سطح پر ایک اور پرند نمودار ہوتا ہے جو ہوا میں اڑتے ہوئے پرندے سے زیادہ سفید اور زیادہ خوبصورت ہے۔

دور، چمکتے ہوئے افق پر ایک ارغوانی جزیرہ دھیرے دھیرے پانی پر بہہ رہا ہے یا شاید سورج کی تپتی ہوئی شعاعوں میں پگھل رہا ہے۔ وہ سمندر کی تہ سے نکلتی ہوئی ایک تن تنہا چٹان ہے، خلیج نیپلس کی انگشتری میں جڑا ہوا ایک تابندہ موتی ہے۔

پتھریلے ساحل کے نوکیلے کونے سمندر کی طرف جھک رہے ہیں۔ اس پر گہرے رنگ کے پتوں والی انگور کی بیلوں، لیموں، انجیر اور سنترے کے درختوں اور ہلکے نقرئی رنگ کے زیتون کے پتوں کا ایک گنجان جال سا بچھا ہوا ہے۔ گنجان اور ایک دم سمندر کے اندر چمکتے ہوئے پتوں کے بیچ میں سے سنہری، لال اور سفید پھول ملائمت

سے مسکرا رہے ہیں اور پیلے اور نارنجی رنگ کے پھول ایک گرم چاندنی رات کے ستاروں کی یاد دلا رہے ہیں جب آسمان کا رنگ گہرا ہوتا ہے اور فضا میں نمی ہوتی ہے۔

سمندر، آسمان اور روح ہر چیز پر سکوت طاری ہے اور اس خاموشی میں آدمی کا دل وہ بے آواز ترانہ حمد سننے کو چاہتا ہے جو زندگی سورج دیوتا کے حضور میں گاتی ہے۔

باغوں کے درمیان ایک پگ ڈنڈی جا رہی ہے اور اس پر ایک دراز قد عورت، سیاہ لباس پہنے ہوئے چل رہی ہے، وہ سبک قدمی سے ایک سے دوسرے پتھر پر سے گزرتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ دھوپ میں اس کا لباس دھبوں دار بھورے رنگ کا معلوم ہو رہا ہے اور اس فرسودہ لباس کے پیوند دور ہی سے نظر آ سکتے ہیں۔ اس کا سر کھلا ہوا ہے اور بال چاندی کی طرح چمک رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے گھونگروں کی شکل میں اس کی اونچی پیشانی، کنپٹیوں اور سانولے سلونے رخساروں پر آئے پڑے ہیں۔ وہ اس قسم کے بال ہیں جنہیں کنگھے سے سنوار کر قابو میں کرنا ناممکن ہے۔

اس کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے اور اس کے خدوخال سے سخت گیری ٹپکتی ہے۔ یہ ایک ایسا چہرہ ہے جسے ایک مرتبہ دیکھ کر کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ اس سخت گیر چہرے میں کوئی امٹ اور ابدی سی چیز ہے اور اگر اس کی سیاہ آنکھوں کی سیدھی نگاہ سے آپ کی نظر مل جائے تو آپ مشرق کے تپتے ہوئے صحراؤں کا، دیبورہ اور جوڈتھ، کا خیال کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

وہ سر جھکائے، کروشیا سے کچھ بنتی ہوئی چل رہی ہے۔ اس کی کروشیا کی سلائی کا ہک چمک رہا ہے، اون کا گولا اس کے لباس میں کہیں چھپا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لال تاگا اس عورت کے دم میں سے نکل رہا ہے۔ پگ ڈنڈی ڈھلوان اور پیچ و خم کھاتی ہوئی ہے، کبھی کبھی نیچے گرتے ہوئے پتھروں کی آواز سنائی دیتی ہے لیکن یہ سفید بالوں والی عورت اس اطمینان اور اعتماد سے چلی جا رہی ہے گویا اس کے پاؤں میں آنکھیں لگی ہیں جو راستہ دیکھ سکتی ہیں۔

اس عورت کی داستان اس طرح سنائی جاتی ہے: یہ بیوہ ہے۔ اس کا شوہر، ایک مچھیرا، شادی کے کچھ ہی عرصے بعد ایک دفعہ مچھلی پکڑنے کے لیے دور سفر پر گیا اور

کبھی واپس نہیں آیا اور اس کے دل کے نیچے ایک بچے کی تخلیق ہونے لگی۔

جب بچہ پیدا ہوا تو ماں نے اسے لوگوں کی نگاہوں سے چھپائے رکھا۔ وہ اور ماؤں کے طرح اس کی نمائش کرنے کے لیے اسے دھوپ میں سڑک پر نہیں نکالتی تھی۔ وہ اسے نہالچے پوتڑوں میں لپیٹ کر اپنی جھونپڑی کے ایک تاریک گوشے میں رکھتی تھی اور بہت دن تک پڑوسی بس بچے کا بہت بڑا سر اور ایک زرہ چہرہ اور بے حد بڑی بڑی پتھرائی ہوئی سی آنکھیں ہی دیکھ سکے۔ لوگوں نے دیکھا کہ تندرست، چست اور پھرتیلی عورت جو کبھی خوش دلی کے ساتھ اور ان تھک طریقے سے غربت سے جنگ آزما ہوتی تھی اور جس نے دوسروں کو بھی قوت اور توانائی سے سرشار کر دیا تھا اب خاموش اور مضمحل ہو گئی ہے اور دنیا کو غم وحسرت کی نقاب کے اندر سے دیکھنے لگی ہے اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سوالیہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

کچھ ہی عرصے کے اندر اندر لوگوں کو اس کی بدقسمتی کا حال معلوم ہو گیا: اس کا بچہ بالکل بدہیئت ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اسے چھپائے رکھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اتنی بدحال اور رنجیدہ رہتی ہے۔

جب پڑوسیوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے اس سے کہا کہ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ کسی عورت کے لئے ایسی عجیب الخلقت مخلوق کو جنم دینا کتنی شرم کی بات ہے اور صرف کنواری مریم ہی جانتی ہیں کہ وہ اس پھوٹی قسمت کو مستحق تھی یا نہیں۔ لیکن جو کچھ بھی ہے بچے کا تو کوئی قصور نہیں تھا اور وہ اسے سورج کی روشنی سے محروم رکھنے میں غلطی پر تھی۔

اس نے ان کی بات مان لی اور انہیں اپنے بیٹے کو دکھا دیا۔ انہوں نے ایک عجیب الخلقت مخلوق دیکھی جس کے بازو اور ٹانگیں مچھلی کے پروں جیسی چھوٹی چھوٹی تھیں اور ایک پتلی، ہڈیالی گردن پہ ایک بے حد بڑا، سوجا ہوا سا سر ڈگمگ ڈگمگ کر رہا تھا، اس کا چہرہ بوڑھوں کی طرح کا تھا، اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور اس کا بے حد لمبا چوڑا منہ موت کی سی مسکراہٹ کے ساتھ کھلا ہوا تھا۔

عورتیں اس کو دیکھ کر رو پڑیں اور مردوں نے اس کو کراہیت سے دیکھا اور

خاموشی سے ایک طرف ہٹ گئے۔ اس عجیب الخلقت مخلوق کی ماں زمین پر بیٹھ گئی، وہ کبھی اپنا منہ چھپالیتی تھی اور کبھی سر اٹھا کر اپنی آنکھوں میں ایک بے آواز سوال لئے ہوئے اپنے پڑوسیوں کو تکنے لگتی تھی۔

پڑوسیوں نے ایک تابوت نما صندوق بنایا، اسے اون کے بچے کھچے ٹکڑوں اور چیتھڑوں سے بھر دیا اور اس بدہیئت مخلوق کو اس نرم و گرم بچھونے پر لٹا دیا اور صندوق کو احاطے کے ایک سایہ دار حصے میں رکھ دیا۔ انہیں دل ہی دل میں یہ امید تھی کہ سورج جو روز اتنی کرامات دکھاتا ہے ایک اور معجزہ کر دکھائے گا۔

لیکن دن گزرتے چلے گئے اور وہ انتہائی بڑا سر اور وہ چار بے بس ہاتھ پاؤں والا لمبا سا جسم بالکل نہیں بدلا۔ صرف اس کی مسکراہٹ میں رفتہ رفتہ ایک ناقابل آسودگی ندیدے پن کا رنگ آگیا اور اس کے دہن میں تیز اور ٹیڑھے میڑھے دانتوں کی دو قطاریں نظر آنے لگیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں نے روٹی کے ٹکڑے پکڑنا اور انہیں سیدھا، ٹھیک اپنے بڑے سے گرم منہ میں ڈالنا سیکھ لیا۔

وہ گونگا تھا لیکن جب کبھی اسے کھانے کی خوشبو آتی تھی تو وہ رونے جھینکنے لگتا تھا، اپنا منہ کھول دیتا تھا اور اپنا بھاری سر ہلاتا تھا اس کی آنکھوں کے گدلے ڈھیلے سرخ خون کے سے رنگ کے ہو جاتے تھے۔

وہ بہت کھاتا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ اس کی کھانے کی صلاحیت بھی بڑھتی گئی۔ اور اس کا رونا جھینکنا چوبیس گھنٹے چلتا رہتا تھا۔ اس کی ماں ان تھک اور جان توڑ محنت کرتی تھی لیکن اس کی آمدنی بہت کم تھی اور کبھی کبھی تو وہ کچھ بھی نہیں کماتی تھی۔ پڑوسیوں کی مدد کو وہ بڑی مجبوری سے اور ہمیشہ بالکل خاموشی سے قبول کرتی تھی لیکن جب کبھی وہ گھر پر نہیں ہوتی تھی تو اس کے ہمسائے ہر وقت کی روں روں سے عاجز آ کر دوڑ کے احاطے میں آتے تھے اور روٹی، ترکاری، پھل...... غرض ہر کھانے کے قابل چیز...... اس منہ میں ٹھونس دیتے تھے جسے کھانے کا ہوکا تھا۔

''کچھ دن جاتے ہیں اور یہ تمہیں بالکل ہی ہڑپ کر جائے گا'' پڑوسیوں

نے ماں سے کہا ''تم آخر اسے کسی اسپتال یا محتاج خانے میں کیوں نہیں رکھتیں؟''

''میں نے اسے جنم دیا'' وہ گلوگیر ہو کر بولی ''اور مجھے ہی اس کو کھلانا پلانا چاہئے۔''

وہ ایک خوبصورت عورت تھی اور ایک دو نہیں کئی آدمی اس کے پریم کے جویا تھے لیکن بے سود۔ اور ان میں سے ایک سے جس سے اسے اوروں سے زیادہ گہرا لگاؤ تھا، اس نے کہا:

''میں تمہاری بیوی نہیں بن سکتی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایک اور عجیب الخلقت مخلوق کو جنم نہ دے دوں۔ میں تمہاری رسوائی اور جگ ہنسائی نہیں کرانا چاہتی۔''

اس آدمی نے اسے سمجھا بجھا کر راضی کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اس عورت کو یاد دلایا کہ کنواری مریم ہر ماں پر مہربان ہیں اور ہر ماں کو اپنی بہن سمجھتی ہیں لیکن عجیب الخلقت مخلوق کی ماں نے جواب دیا:

''میں نہیں جانتی کہ میں نے کیا گناہ کیا ہے لیکن دیکھو مجھے کتنی خوفناک سزا ملی ہے۔''

اس آدمی نے اس کو منت سماجت کی، رویا، گڑگڑایا، دیوانہ وار ہو گیا لیکن اس نے کہا:

''نہیں میں اپنے ایمان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ چلے جاؤ!''

اور وہ کہیں دور دیس میں چلا گیا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔

اور اس طرح کئی سال تک وہ اس اتھاہ دھن کے لئے، اس ہر وقت چلتے ہوئے جبڑے کے لیے روٹی مہیا کرتی رہی۔ وہ اس کی محنت کے پھل ہڑپ کر جاتا تھا اور اس کی زندگی اور اس کے خون کو چوس رہا تھا۔ اس کا سر مسلسل بڑھتا ہی رہا اور بے حد خوفناک اور بڑا ہو گیا۔ وہ ایک بے حد بڑی گیند سے مشابہ تھا جو کسی بھی لمحے اپنے آپ کو اس کمزور اور سوکھی گردن سے الگ کر کے مکانوں کی چھتوں پر چل پڑنے اور کونوں سے ٹکرانے اور کاہلی سے ادھر ادھر ہلنے جلنے والی ہو۔

ہر وہ اجنبی جس کی اتفاق سے احاطے پر نظر جا پڑتی تھی ٹھٹک جاتا تھا، اس

منظر سے اس پر دہشت سی چھا جاتی تھی اور وہ اس کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوتا تھا۔ عشق پیچاں کی بیلیں چڑھی ہوئی دیوار کے پاس ایک پتھروں کے ڈھیر کے اوپر...... گویا کسی قربان گاہ کے اوپر ہو...... وہ عجیب وغریب شکل کا صندوق رکھا رہتا تھا جس میں سے وہ بدہیئت سر نکلا ہوا نظر آتا تھا۔ سبز عشق پیچاں کے پس منظر، میں وہ پیلا، جھریوں پڑا ہوا، چوڑے نقشے والا چہرہ دیکھنے والوں کی توجہ کو کھینچ لیتا تھا اور جو آدمی اسے ایک دفعہ دیکھ لیتا تھا وہ آسانی سے ان ابلتی ہوئی آنکھوں، ان خالی خالی، تکتی ہوئی نگاہوں، اس چپٹی چوڑی ناک، ان غیر فطری طور پر بڑھے ہوئے گالوں اور گالوں کی ہڈیوں، ان لرزتے ہوئے پلپلے، تھل تھل ہونٹوں کو جن کے بیچ میں سے بے رحم دانتوں کی دولڑیاں نظر آتی تھیں اور اس کے بے حد بڑے اور حساس، جانوروں کے سے، کانوں کو جن کی اپنی ایک علیحدہ زندگی معلوم ہوتی تھی، غرض اس پورے کریہہ المنظر، ماسک نما چہرے کو، جس کے سر پر ایک حبشی کے سے چھوٹے چھوٹے گھونگر پڑے ہوئے سیاہ بالوں کا ایک ڈھیر اگا ہوا تھا، نہیں بھلا سکتا تھا۔

اپنے چھپکلی کے پنجے کے سے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں کوئی کھانے کی چیز پکڑ کے وہ اسے اپنے دانتوں سے کترنے لگتا تھا اور ایک دانہ چگتی ہوئی چڑیا کی طرح اپنا سر آگے پیچھے ہلاتا رہتا تھا اور زور زور سے ناراضگی کی سی آوازیں نکالتا تھا۔ کھانے کے بعد وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو نظر اٹھا کر دیکھتا تھا اور پھر اپنی آنکھیں اپنی ناک کے بانسے پر گاڑ لیتا تھا جو اس کے موت کے سے کرب میں مبتلا، تشنجی چہرے پر ایک گدلے گدلے، موٹے دھبے کی شکل میں پڑی ہوئی تھی۔ جب وہ بھوکا ہوتا تھا تو اپنی گردن آگے بڑھا لیتا تھا، اپنے لال لال جبڑے کو کھول لیتا تھا اور اپنی لمبی، سانپ کی سی زبان کو اینٹھ اور مروڑ کر کھانے کے لیے رونے جھینکنے لگتا تھا۔

نظارہ کن اس منظر کو دیکھ کر اپنے اوپر صلیب کا نشان بناتے تھے، دعائیں پڑھتے تھے اور ایک طرف ہٹ جاتے تھے۔ انہیں اچانک اس تمام شر اور خباثت کا اور ان تمام بدنصیبوں کا خیال آجاتا تھا جن سے انہیں کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

بوڑھا، تندخو لوہار کئی دفعہ کہہ چکا تھا:

"جب میں اس سب کچھ ہڑپ کر جانے والے منہ کو دیکھتا ہوں تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس قسم کی کسی چیز نے میری تمام طاقت کو ہڑپ کر لیا ہے اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ ہم سب دوسروں کا خون چوسنے والوں ہی کے لئے جیتے ہیں اور انہیں کے لئے مرتے ہیں۔"

وہ گونگا سر ہر شخص کے دل میں غم آگیں خیالات اور احساسات پیدا کر دیتا تھا جن سے دہشت زدہ ہو کر انسانی روح نفرت اور کراہیت سے دور بھاگتی تھی۔

اس عجیب الخلقت مخلوق کی ماں خاموشی سے اس کے متعلق کہی جانے والی ساری باتوں کو سنتی رہتی تھی۔ اس کے بال بہت تیزی سے سفید ہو گئے، اس کے چہرے پر لکیریں پڑ گئیں اور ہنسنا تو وہ عرصے سے بھول چکی تھی۔ لوگ جانتے تھے کہ راتوں کو وہ دروازے پر بے حس و حرکت کھڑی آسمان کو تکا کرتی تھی جیسے کسی کی منتظر ہو۔

"یہ کسی چیز کا انتظار کرتی ہے؟" وہ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے۔

"اسے پرانے گرجا کے پاس چوک میں رکھ دو!" اس کے ہمسایوں نے مشورہ دیا۔ "وہاں سے اکثر غیر ملکی لوگ گزرتے ہیں، وہ ہر روز اس کی طرف دو چار پیسے پھینکنے میں بخل نہیں کریں گے۔"

لیکن ماں اس خیال سے ہی لرز اٹھی۔

"بدیشیوں کے سامنے اس کی نمائش کرنا بہت بری بات ہے" اس نے کہا "وہ بھلا ہمارے متعلق کیا سوچیں گے!"

"غربت کہاں نہیں ہے؟" انہوں نے اس سے کہا "یہ ہر شخص جانتا ہے!"

اس نے سر ہلایا۔

لیکن بدیشی لوگ اکتا کر ہر طرف گھومتے پھرتے تھے اور ہر احاطے میں جھانکتے تھے اور ظاہر ہے ایک دن وہ اسی طرح گھومتے گھامتے اس کے احاطے میں بھی آ گئے۔ وہ گھر پر ہی تھی اور اس نے ان بیکار لوگوں کے چکنے چپڑے چہروں پر نفرت اور

کراہیت کا رنگ آتا دیکھا۔ اس نے انہیں اپنے بیٹے کے متعلق باتیں کرتے ہوئے سنا۔ ان کی آنکھیں سکڑ گئیں اور ان کے دانت تضحیک کے انداز میں نکل پڑے۔ اس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ چند الفاظ تھے جو حقارت، مخاصمت اور کھلم کھلا بدباطنی کے انداز میں کہہ گئے تھے اور جو اس نے سن لئے تھے۔

اس نے بدیشی آوازوں کو زبانی یاد کرلیا اور انہیں بار بار دھرایا کیونکہ اس کے دل نے...... ایک اطالوی عورت اور ماں کے دل نے...... اس توہین کو محسوس کرلیا جو ان الفاظ میں چھپی ہوئی تھی...... وہ اپنی جان پہچان کے ایک کمشنر کے پاس گئی اور اس سے پوچھا کہ ان الفاظ کا کیا مطلب ہے۔

''یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ کسی کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔'' اس نے تیوری پر بل ڈال کر جواب دیا۔ ''ان کا مطلب ہے: اطالیہ دوسری رومن نسلوں سے زیادہ تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ تم نے یہ جھوٹ بات کہاں سنی؟''

وہ جواب دیے بغیر چلی گئی۔

اگلے دن اس کا بیٹا زیادہ کھانے کے باعث تشنج اور اینٹھن کے دوروں کے بعد مر گیا۔

وہ احاطے میں صندوق کے پاس بیٹھی تھی اور اس کا ہاتھ اپنے بیٹے کے بے جان سر پر رکھا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے کسی چیز کی منتظر تھی اور ان سب لوگوں کی آنکھوں کے اندر جو لاش کے دیکھنے آ رہے تھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

کوئی کچھ نہیں بولا۔ کسی نے اس سے کوئی سوال نہیں کیے، حالانکہ غالباً بہت سے لوگ اس کو اس غلامی سے نجات پانے پر مبارکباد دینا چاہتے تھے اور اسے تسلی تشفی دینا چاہتے تھے کیونکہ کچھ بھی ہو اس کا بیٹا مر گیا تھا۔ لیکن کوئی کچھ نہیں بولا۔ بعض دفعہ لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔

اس کے بعد بہت دن تک وہ اپنی آنکھوں میں وہی بن کہا سوال لئے اپنے پڑوسیوں کو تکتی رہی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی ان سب ہی کی طرح سادہ دل ہو گئی۔

میکسم گورکی

اطالیہ کے لئے خواب

رات مخملی پوشاک میں ملبوس، ملائم ملائم قدموں سے مرغزار سے شہر کی طرف آرہی ہے اور شہر لاکھوں سنہری روشنیوں کے ساتھ اس کا سواگت کرتا ہے۔ دو عورتیں اور ایک نوجوان کھیتوں سے گزر رہے ہیں گویا وہ بھی رات کا استقبال کر رہے ہوں اور ان کے پیچھے دن بھر کی محنت کے بعد آرام کی تیاری کرتے ہوئے شہر کا دبا دبا شور آرہا ہے۔

چھ پاؤں آہستہ آہستہ اس قدیم سڑک کے سیاہ پتھروں پر پڑ رہے ہیں جسے روما کی مختلف النسل غلاموں نے بنایا تھا اور اس گرم سکوت میں ایک عورت کی صاف اور مدھ بھری آواز گونجتی ہے:

"لوگوں کے ساتھ سختی سے نہ پیش آؤ......"

"کیا تم نے کبھی مجھے سخت اور درشت دیکھا ہے، ماں؟" نوجوان پرفکر لہجے میں پوچھتا ہے۔

"تم بحث مباحثہ بہت جوش اور شدت کے ساتھ کرتے ہو......"

"میں صداقت سے بہت جوش اور شدت کے ساتھ محبت کرتا ہوں۔"

نوجوان کے بائیں ہاتھ پر ایک لڑکی چل رہی ہے اور اس کے لکڑی کے جوتے پتھروں سے ٹکرا رہے ہیں۔ وہ ایسے چل رہی ہے جیسے نابینا ہو، اس کا چہرہ آسمان

کی طرف اٹھا ہوا ہے جہاں شام کے ستارے اپنی پوری آب و تاب سے فروزاں ہیں اور ان کے نیچے شفق شام کی دمک ہے اور اس سرخی کے پس منظر میں دو درخت جلی مشعلوں کی طرح نقش ہیں۔

''سوشلسٹوں کو اکثر جیل بھیج دیا جاتا ہے'' ماں نے ایک ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

''ہمیشہ حالات ایسے نہیں رہیں گے'' بیٹے نے طمانیت سے جواب دیا ''اس کا کوئی فائدہ نہیں کہ......''

''ہاں لیکن اس وقت تک......''

''کوئی طاقت ایسی نہیں ہے نہ کبھی ہو گی جو دنیا کے نوجوان دل کو ختم کر سکے......''

''یہ الفاظ تو گیت کے لیے موزوں ہیں، میرے بچے......''

''لاکھوں آدمی یہ گیت گا رہے ہیں، ماں، اور پوری دنیا اسے روز بروز زیادہ دھیان سے سن رہی ہے...... خود تم بھی پہلے کبھی میرے اور پاؤلو کی بات کو اس قدر ہمدردی اور صبر سے نہیں سنتی تھیں جیسا تم اب سنتی ہو۔''

''ہاں، ہاں!...... لیکن اسٹرائک نے تمہیں تمہاری جنم بھومی سے نکلوا دیا......''

''وہ ہم دو کے لئے بہت چھوٹی جگہ ہے۔ پاؤلو وہاں رہے، ٹھیک ہے! لیکن اسٹرائک میں جیت ہماری ہوئی......''

''ہاں'' لڑکی نے گرم جوشی سے کہا ''تم اور پاؤلو......''

اس نے بات پوری نہیں کی اور دھیرے دھیرے ہنسنے لگی۔ پھر وہ سب چند منٹ خاموشی سے چلتے رہے۔ ان کے سامنے کسی عمارت کا کھنڈر تاریکی میں سے نمودار ہوا اس کے اوپر ایک میٹھی میٹھی خوشبو والا یوکلپٹس اپنی نازک شاخیں پھیلائے ہوئے تھا اور جب وہ تینوں اس کے قریب پہنچے تو شاخیں ایک ہلکے سے ارتعاش کے ساتھ سرسرانے لگیں۔

''یہ پاؤلو ہے۔'' لڑکی نے کہا۔

ایک لمبا سا شخص کھنڈر سے نکل کر سڑک کے بیچوں بیچ آ گیا۔

''کیا تمہارے دل کو خبر ہو گئی تھی کہ یہ پاؤلو ہے؟'' نوجوان نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''یہ تم ہو؟'' صدائے بازگشت کی طرح ایک مردانہ آواز آئی۔

''ہاں، ہم آ گئے۔ تمہیں میرے ساتھ اور آگے جانے کی ضرورت نہیں ہے، روم تک فقط پانچ گھنٹے کی مسافت ہے اور میں نے پیدل چلنا اس لیے پسند کیا تا کہ راستے میں اپنے خیالات کو مجتمع اور مرتب کر سکوں......''

وہ رک گئے۔ لمبے آدمی نے اپنا ہیٹ اتار لیا۔

''اپنی ماں اور بہن کی طرف سے کوئی فکر نہ کرنا'' اس نے رقت بھری آواز میں کہا ''سب ٹھیک ٹھاک رہے گا!''

''میں جانتا ہوں۔ خدا حافظ، ماں!''

وہ آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہی تھی۔ پھر تین بندوں کی آواز آئی اور ایک مردانہ آواز نے کہا: ''اب گھر جا کر آرام کرو، تمہیں بہت تھکن ہو گئی ہو گی۔ جاؤ سب ٹھیک ٹھاک رہے گا! پاؤلو تمہارے لئے میرے برابر ہی ہے، اچھا ننھی بہن......''

پھر بوسے اور پتھروں پر قدموں کی سوکھی سوکھی سرسراہٹ۔ رات کے چونکنے سکوت میں ساری آوازیں اس طرح منعکس ہوتی ہیں جیسے آئینے میں چیزیں۔

تاریکی میں ملفوف سیاہ پیکر ایک دوسرے میں جذب سے ہو گئے اور کچھ دیر تک الگ الگ نہیں ہو سکے۔ پھر خاموشی سے انہوں نے خود کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔ ان میں سے تین دھیرے دھیرے قدموں سے شہر کی روشنیوں کی سمت چلنے لگے اور ایک تیزی سے مغرب کی جانب روانہ ہوا جہاں اب شفق کی سرخی مدھم پڑ چکی تھی اور لاکھوں ستارے آسمان کو منور کیے ہوئے تھے۔

''خدا حافظ!'' ایک دکھ بھری پکار دھیرے سے رات کے سکوت میں گونج

گئی۔

اور دور سے ایک بشاش آواز نے جواب دیا: ''خدا حافظ۔ غمگین مت ہو، ہم جلد ہی پھر ملیں گے۔''

لڑکی کے چوبی جوتے پتھروں سے لگ کر ایک کھوکھلی سی آواز پیدا کر رہے تھے اور نوجوان شخص ایک خفیف سی بھرائی ہوئی آواز میں تسلی تشفی کے الفاظ کہہ رہا تھا:

''ڈونا فیلومینا، وہ بالکل ٹھیک ٹھاک رہے گا۔ آپ اس بات کا اتنا ہی یقین کیجئے جتنا کنواری مریم کے رحم و کرم کا کرتی ہیں۔ وہ مضبوط دل اور سمجھ بوجھ رکھنے والے دماغ کا مالک ہے۔ وہ محبت کرنا اور دوسروں کو اپنے سے محبت کرانا جانتا ہے...... اور اپنے ہم جنسوں کی محبت آدمی کو بال و پر عطا کر دیتی ہے جن کی مدد سے آدمی ہر چیز سے زیادہ اونچا اڑ سکتا ہے......''

شہر تاریکی میں اپنی مدھم روشنیاں زیادہ سے زیادہ پھیلاتا جا رہا ہے۔ لمبے آدمی کے الفاظ بھی چنگاریوں کی طرح چمک رہے ہیں۔

''جو آدمی اپنے دل میں وہ لفظ لئے ہوئے ہے جو تمام دنیا کے باسیوں کو متحد کرتا ہے اسے ہمیشہ ایسے لوگ مل جائیں گے جو اس کا سواگت کرینگے۔ ہمیشہ!''

شہر پناہ سے نکلتے ہی ایک نیچا سا سفید شراب خانہ ہے جو اپنے روشن دروازے کی چوکور آنکھ سے راہگیروں کو دعوت دینے والے انداز سے دیکھ رہا ہے۔ دروازے کے قریب تین چھوٹی میزوں پر سیاہ سیاہ سے پیکر بیٹھے تھے اور لرزتے ہوئے گیتاروں اور سارنگی کے تاروں کی تن تن کی ہم نوائی میں زور شور سے ہنس بول رہے تھے اور تفریح کر رہے تھے۔

جس وقت وہ تینوں دروازے پر پہنچے تو سنگیت ختم گیا، آوازیں دھیمی ہو گئیں اور کئی آدمی کھڑے ہو گئے۔

''سلام، ساتھیو!'' دراز قد شخص نے کہا۔

اور کوئی ایک درجن آوازوں نے جوش اور شوق کے ساتھ جواب دیا:

''سلام پاؤلو، ساتھی! ہمارے ساتھ شامل ہونگے؟ شراب کا ایک جام؟''
''نہیں...... شکریہ!''

ماں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا: ''ہمارے آدمی تم سے بھی محبت کرتے ہیں۔''

''اوہ میرے اوپر ہنسو مت۔ میں اپنے جیسے لوگوں کے لئے اجنبی تھوڑا ہی ہوں۔ وہ سب تم سے محبت کرتے ہیں تم سب اور اس سے......''

لمبے آدمی نے لڑکی کا بازو پکڑ لیا۔ ''سب اور ایک اور بھی۔'' اس نے کہا'' میں ٹھیک کہتا ہوں؟''

''ہاں'' لڑکی نے دھیرے سے کہا۔ ''ظاہر ہے۔''

ماں ہنسی۔ ''اوہ میرے بچو! جب میں تمہیں دیکھتی ہوں اور تمہاری باتیں سنتی ہوں تو یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ تمہاری زندگی یقیناً ہماری زندگی سے بہتر ہو گی......''

اور تینوں شہر کی سڑک پر، جو ایک پرانے فرسودہ لباس کے آستینوں کی طرح تنگ اور بوسیدہ تھی، نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میکسم گورکی

ہڑتال

نیپلس میں ٹرام کے ملازمین نے اسٹرائک کر رکھی تھی۔ ریویرادی کیایا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خالی ٹراموں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی اور کنڈکٹروں اور ڈرائیوروں کی...... ان زندہ دل، باتونی اور پارے کی طرح بے تاب اور پھرتیلے نیپلسیوں کی...... ایک بڑی تعداد پیازا دیلا ویتوریا پر جمع ہو گئی تھی۔ ان کے سروں سے اوپر اور پارک کی باڑ کے اوپر ایک فوارہ، تلوار کے نازک پھل کی مانند، چمک دمک رہا تھا اور ان کے اردگرد ایک بڑا سا مخالفانہ مجمع ایسے لوگوں کا جمع ہو گیا تھا جنہیں اس وسیع وعریض شہر کے مختلف حصوں میں اپنے اپنے کام سے جانا تھا اور یہ سب دوکان داروں کے مددگار، درزنیں، دستکار اور سودے والے زور زور سے اسٹرائک کرنے والوں کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ تیز تیز الفاظ اور چبھتے ہوئے فقرے ایک دوسرے کو کہے جا رہے تھے اور ہاتھ ہلا ہلا کر خوب اشارے ہو رہے تھے کیونکہ نیپلس والے اپنے ہاتھوں سے بھی اسی قدر زور اور فصاحت کے ساتھ بولتے ہیں جتنا اپنی ان تھک زبانوں سے بولتے ہیں۔

سمندر سے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آ رہے تھے، شہر کے پارک میں لمبے لمبے پام کے درختوں کے گہرے سبز رنگ کے پتے اور ڈالیں آہستہ آہستہ جھوم رہی تھیں اور ان کے تنے بہت ہی بڑے بڑے ہاتھیوں کی بھدی ٹانگوں سے مشابہ معلوم ہو رہے تھے۔ لونڈے لارے، نیپلس کی سڑکوں کے نیم عریاں بچے، فضا کو اپنے قہقہوں اور

چیچھوں سے بھرے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

شہر، جو ایک قدیم کندہ کاری کی تصویر کی مانند معلوم ہوتا تھا، جلتے تپتے سورج کی ان گنت شعاعوں میں نہایا ہوا تھا اور ارغنون کی طرح نغمہ سرا تھا۔ خلیج کی نیلی موجوں کے پتھریلے ساحل سے ٹکرانے کی آواز شہر کے غل شور اور چیخ پکار میں ایک دبی دبی، طنبورے کے ارتعاش سے ملتی جلتی آواز کا اضافہ کر رہی ہے۔

اسٹرائک کرنے والے آزردگی اور افسردگی سے ایک دوسرے سے ملے ملے کھڑے ہیں اور مجمع کی چڑ چڑی چیخوں کا مشکل ہی سے کوئی جواب دے رہے ہوں تو دے رہے ہوں۔ ان میں سے بعض پارک کے جنگلے کے اوپر چڑھ کر، فکر مندی سے لوگوں کے سروں کے پار، سڑک کی طرف دیکھ رہے ہیں اور وہ شکاری کتوں سے گھرے ہوئے بھیڑیوں کے ایک غول کی طرح دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ ان وردی پوش لوگوں کو اپنی بات پر اڑے رہنے کے عزم مصمم نے ایک ہی بندھن میں باندھ دیا تھا اور اس بات سے مجمع اور بھی زیادہ چڑ گیا تھا۔ لیکن مجمع کے اپنے فلسفی موجود تھے۔ پرسکون انداز سے سگریٹ پیتے ہوئے وہ اسٹرائک کرنے والوں کے زیادہ جوشیلے مخالفوں کو اس طرح سمجھا بجھا رہے تھے:

"اوہ، سینیور! اگر آدمی اپنے بچوں کے لیے ماکارونی بھی مہیا نہ کر سکے تو آخر وہ کیا کرے؟"

میونسپل پولیس کے بنے ٹھنے ایجنٹ اس بات کا خیال رکھنے کے لئے دو دو تین تین کی ٹولیوں میں کھڑے ہوئے تھے کہ مجمع گاڑیوں کی آمد و رفت میں حارج نہ ہو، وہ مکمل غیر جانب داری کا مظاہرہ کر رہے تھے، برا کہنے اور برا سننے والوں سب کو ایک ہی سے سکون اور طمانیت کے ساتھ دیکھ رہے تھے اور جب چیخیں اور ہاتھ کے اشارے بہت زیادہ گرم اور پرجوش ہو جاتے تھے تو وہ دونوں ہی طرف کے لوگوں کو خوش مزاجی سے ڈانٹ پھٹکار دیتے تھے۔ کارابینیری [1] کا ایک دستہ اپنی چھوٹی اور ہلکی رائفلیں لئے

ہوئے ایک تنگ سی گلی میں عمارتوں سے لگا ہوا زیادہ گمبھیر ٹکراؤ ہو جانے کی صورت میں مداخلت کرنے کے تیار کھڑا تھا۔ اپنی سہ گوشیہ ٹوپیوں، چھوٹے چھوٹے لبادوں اور خون کی لکیروں کی طرح کی دو دو ارغوانی رنگ کی دھاریوں والے پاجاموں میں ملبوس یہ گروپ خاصا منحوس معلوم ہو رہا تھا۔

جھڑپ، جھگڑے، لعن طعن، سمجھانا بجھانا، طنز و ملامت سب کچھ یکبارگی بند ہو گیا۔ مجمع میں ایک نئی اور گویا سکون بخش اسپرٹ پیدا ہوگئی۔ اسٹرائک کرنے والے افسردہ نگاہی کے ساتھ ایک دوسرے کے اور قریب آگئے اور مجمع میں سے ایک آواز بلند ہوئی:

''فوج!''

اسٹرائک کرنے والوں پر طنزیہ اور فتح مندانہ سیٹیاں بجائی گئیں اور ان کی آوازیں خیر مقدم کے نعروں کے ساتھ مل جل گئیں۔ ایک ہلکے جستی رنگ کے سوٹ اور پناما ہیٹ میں ملبوس ایک فربہ اندام شخص ایک دم اچھلنے لگا اور اپنے پاؤں پتھریلے فٹ پاتھ پر مارنے لگا۔ کنڈکٹر اور ڈرائیور مجمع کے درمیان سے دھیرے دھیرے گزرتے ہوئے گاڑیوں کی طرف بڑھے اور ان میں سے کچھ اوپر بھی چڑھ گئے۔ مجمع میں سے گزرتے ہوئے اور اپنے چاروں طرف کے فقروں اور چیخوں کے تیز تیز جواب دیتے ہوئے وہ اور بھی زیادہ افسردہ جاں معلوم ہو رہے تھے۔ شور و غل کم ہو گیا تھا۔

سانتا لوچیا ساحل کی طرف سے چھوٹے چھوٹے، خاکستری سپاہی سبک رفتاری سے چلے آ رہے تھے، ان کے قدم تال دے رہے تھے اور ان کے بائیں بازو میکانکی طریقے سے جھول رہے تھے۔ وہ ٹین کے سپاہی معلوم ہو رہے تھے۔ اور کھلونوں کی طرح کمزور۔ ان کی قیادت ایک دراز قد، خوبصورت افسر کر رہا تھا جس کی بھویں چڑھی ہوئی تھیں اور ہونٹ ایک حقارت آمیز انداز میں مڑے ہوئے تھے۔ اس کے نزدیک ہی ایک لمبا سا ہیٹ اوڑھے ہوئے فربہ اندام شخص بے حد باتیں کرتا اور ہوا کو ان گنت ہاتھ کی جنبشوں اور اشاروں سے چیرتا ہوا پھدکتا چلا جا رہا تھا۔

مجمع گاڑیوں سے دور ہٹ گیا۔ سپاہی خاکستری موتیوں کی طرح ادھر ادھر بکھر گئے اور گاڑیوں کے پلیٹ فارموں کے پاس، جہاں اسٹرائک کرنے والے کھڑے ہوئے تھے، جا کر استادہ ہو گئے۔

لمبے ہیٹ والا آدمی اور دوسرے کئی معزز صورت لوگ، جو اس کے اردگرد کھڑے تھے، پاگلوں کی طرح اپنے ہاتھ ہلانے اور چلانے لگے:

''آخری بار...... آخری بار! سنتے ہو؟''

افسر اپنا سر ایک طرف جھکائے، ایک اکتائے ہوئے سے انداز میں کھڑا اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ وہ آدمی اپنا لمبا ہیٹ ہلاتے ہوئے اس کی طرف دوڑا اور بیٹھی ہوئی سی آواز میں چیخ کر کچھ کہا۔ افسر نے اسے کنکھیوں سے دیکھا، پھر تن کر کھڑا ہو گیا، اپنا سینہ نکالا اور ایک اونچی آواز میں احکام دینے لگا۔

تب سپاہیوں نے کود کود کر گاڑیوں کے پلیٹ فارموں پر چڑھنا شروع کیا۔ ایک ایک پلیٹ فارم پر دو دو سپاہی۔ اور ڈرائیور اور کنڈکٹر ایک ایک کر کے اترنے لگے۔

مجمع کو یہ بات بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوئی۔ اور وہ چیخنے، ہنسنے اور سیٹیاں بجانے لگا، مگر یکا یک شور و غل مدھم پڑ گیا اور لوگ خوف و دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھوں اور آزردہ چہروں کے ساتھ، گہری خاموشی سے گاڑیوں سے دور ہٹ گئے اور سب سے اگلی گاڑی کی طرف جمع ہونے لگے۔

وہاں، گاڑی کے پہیوں سے دو انچ کے فاصلے پر، ایک ڈرائیور پٹری پر لمبا لمبا پیٹھ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سفید سر کھلا ہوا تھا، اس کا چہرہ ایک سپاہی کا سا تھا اور اس کی مونچھیں غصے سے پھڑک رہی تھیں اور ان کا رخ آسمان کی سمت تھا۔ مجمع منہ کھولے اس منظر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک بندر کے سے پھرتیلے اور مختصر لڑکے نے بھی خود کو ڈرائیور کے برابر زمین پر گرا دیا اور اس کے بعد ایک ایک کر کے کئی اور لوگوں نے بھی یہی حرکت کی۔

مجمع میں سے ایک ہلکی، بھنبھناہٹ کی سی آواز پیدا ہوئی، کچھ لوگ ڈرے سہمے کنواری مریم سے دعا مانگنے لگے، کچھ خفگی سے کوسنے پیٹنے لگے، عورتیں چیخنے اور کراہنے لگیں اور لونڈے مارے جوش اور مسرت کے ربر کی گیندوں کی طرح اچھلنے لگے۔

لمبے ہیٹ والے آدمی نے ایک ہسٹیریائی آواز میں چیخ کر کچھ کہا، افسر نے اسے دیکھا اور اپنے شانے ہلا دیئے۔ اس کے سپاہی ٹرام کے ملازموں سے لے کر ٹرامیں اپنے قبضے میں کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے لیکن اس کو اسٹرائک کرنے والوں سے لڑنے کا حکم نہیں ملا تھا۔

تب لمبا ہیٹ، چند اور خدمت خلق پر تلے ہوئے شہریوں کی معیت میں کارابینیریوں کی طرف دوڑا اور پھر کارابینیری اس ارادے سے پٹریوں پر لیٹے ہوئے لوگوں پر جھکے کہ انہیں وہاں سے ہٹا دیں۔

اب کشمکش شروع ہوئی، لیکن یکبارگی تماشائیوں کا پورے کا پورا بھورے رنگ کا گردآلود مجمع متحرک ہوا، چیخا، دھاڑا اور پٹریوں کی طرف دوڑ پڑا...... پناما ہیٹ والے شخص نے اپنا ہیٹ اتار لیا اور اسے ہوا میں اچھال دیا اور وہ سب سے پہلا آدمی تھا جو آخر میں لیٹے ہوئے اسٹرائک کرنے والے کے برابر زمین پر جا لیٹا اور اس کے شانے تھپکنے اور اس سے دل بڑھانے والے الفاظ کہنے لگا۔

ایک ایک کر کے لوگ پٹریوں پر لیٹنے لگے، گویا ان کی ٹانگیں جواب دے رہیں ہوں۔ زندہ دل، پرشور، باتونی قسم کے لوگ جو ابھی دو ہی منٹ پہلے تک وہاں موجود بھی نہ تھے۔ وہ زمین پر لیٹ گئے اور ہنسنے، ایک دوسرے کا منہ چڑانے اور افسر سے چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگے جو اونچے ہیٹ والے شخص سے مصروف گفتگو تھا اور خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی ناک کے نیچے اپنے دستانے ہلا رہا تھا اور اپنے خوبصورت سر کو جھٹک رہا تھا۔

اور زیادہ لوگ پٹریوں پر لیٹتے گئے، عورتوں نے اپنی ٹوکریاں اور بنڈل زمین پر گرا دیئے، چھوٹے چھوٹے لڑکے، مارے ہنسی کے بے تاب تھرتھراتے ہوئے پلوں کی

طرح سکڑ سکڑ کر پڑ گئے، اچھی بھلی معقول پوشاکوں میں ملبوس لوگ بھی گردوغبار میں لوٹ لگانے لگے۔

اگلی گاڑی کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے پانچ سپاہی پہیوں کے آس پاس پڑے ہوئے اور سہارے کے لیے سلاخوں کو پکڑے ہوئے تھے، وہ اپنے سر پیچھے ڈال دیتے تھے اور پھر آگے کی طرف جھک جاتے تھے اور ان پر ہنسی کا دورہ سا پڑا ہوا تھا۔ اب وہ قطعی ٹین کے سپاہی نہیں معلوم ہو رہے تھے۔

......آدھے گھنٹے بعد ٹرامیں کھڑکھڑاتی، دھڑدھڑاتی نیپلس کی سڑکوں پر چل رہی تھیں اور پلیٹ فارموں پر فاتح کھڑے تھے جن کے چہرے مارے خوشی کے کھل اٹھے تھے اور نیچے بھی فاتح چل رہے تھے اور شائستگی سے لوگوں سے پوچھ رہے تھے:

"ٹیلیتی ؟!"

اور مسافر آنکھیں مار مار کر، مسکرا مسکرا کر اور خوش مزاجی کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے انہیں لال اور پیلے نوٹ پکڑا رہے تھے۔

میکسم گورکی

ایسٹر

ایسٹر سے پہلے کا سنیچر۔ چاند کی غیر موجودگی کے باعث جو اندھیرا چھایا ہوا ہے اس میں ایک عورت سیاہ کپڑوں میں لپٹی ہوئی شہر کے نواحی علاقے کی تنگ گلیوں میں سے آہستہ آہستہ گزرتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے سر پر جو ہڈ تھا اس نے اس کے چہرے کو بھی چھپا رکھا تھا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے لبادے کی بے شمار تہوں کی وجہ وہ غیر معمولی طور پر لمبی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے چلی جا رہی تھی۔ اتھاہ اور بے اندازہ غم والم کا مجسمہ۔

اس کے پیچھے، اسی قدر آہستہ خرامی کے ساتھ موسیقار چلے آ رہے تھے۔ ان کی ٹولی میں سب لوگ ایک دوسرے سے اس قدر قریب تھے کہ وہ ایک جسم واحد معلوم ہو رہی تھی۔ اور ان کے سروں کے اوپر ان کے سازوں کے پیتل کے مہیب منہ تھے۔ ان میں سے بعض آگے کو نکلے ہوئے تھے، بعض سیاہ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور سبھی کراہ رہے تھے، چلا رہے تھے: بانسریاں اپنے ماتمی گیت گا رہی تھیں جیسے ایک طویل شب بیداری اور عبادت کے بعد بہت سے راہب مل کر گا رہے ہوں اور الغوزوں کی آواز ہیبت ناک طریقے سے چلتی ہوئی ہوا کا خیال دلا رہی تھی، نرسنگوں نے اس میں اپنی گلا پڑی ہوئی آواز والی آہ وزاری کا اضافہ کر دیا تھا اور غمگین فرانسیسی قرنے اس کے جواب میں گونج رہے تھے اور سکسنکھ اپنا سوگوار راگ الاپ رہا تھا، بڑا نقارہ ایک افسردہ

مارچ کی تال دے رہا تھا اور چھوٹے نقارے کی سوکھی سوکھی کھٹ کھٹ پتھروں پر پڑتے ہوئے سینکڑوں پیروں کی دھپ دھپ کے ساتھ مل جا رہی تھی۔

پیتل پر ایک بے جان سے پیلی پیلی چمک تھی، اس کے پھندے میں پھنسے ہوئے آدمی کسی دوسری دنیا کی عجیب الخلقت مخلوق کی مانند دکھائی دے رہے تھے چوبی ساز تھوتھنی کی طرح آگے کو نکلے ہوئے تھے اور سازندوں کا طائفہ بھوری دیواروں کے بیچ کی تنگ سڑکوں پر مشکل سے رینگتے ہوئے ایک دیو قامت سیاہ سانپ کے سر کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ عجیب جلوس ان چھوٹے چھوٹے، ٹیڑھے میڑھے چوکوں میں سے کسی نہ کسی میں پہنچ جاتا تھا جو زمانے کے ہاتھوں شہر کی پتھریلی پوشاک میں پڑے ہوئے سوراخوں سے مشابہ تھے اور دوبارہ پھر دب گھس کر کسی بے حد پتلی سی سڑک پر نکل آتا تھا گویا اس کی دیواروں کو ڈھا دینے کے ناکام کوشش کر رہا ہو، گھنٹوں یہ مہیب سانپ، جس کے مختلف ٹکڑے جیتے جاگتے انسانی جسموں پر مشتمل تھے، آسمان کے پُرسکوت قبے کے نیچے، اس عورت کے پراسرار پیکر کے نقش قدم پر چلتا ہوا شہر میں رینگتا رہا۔

اور اس خاموش، سیاہ پوشاک میں ملبوس اور گویا رنج و غم کے ناقابل تسخیر زرہ بکتر میں ملفوف عورت نے رات کی تاریکی میں اپنی جستجو جاری رکھی اور اس طرح وہ تماشائیوں کے تخیل کو قدیم عقائد کی تاریک گہرائیوں کی طرف لے جا رہی تھی اور لوگوں کو "آئی سیس" کی یاد دلا رہی تھی جس کا بھائی اور شوہر خبیث "سیتھ" کے پھندے میں پھنس گئے تھے اور اس کے عجیب و غریب پیکر سے ایک تاریکی کا حلقہ سا نکلتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ جس نے گرد و پیش کی ہر چیز کو ماضی کے اس دھندلکے میں ملفوف کر رکھا تھا جس میں اس رات ایک دفعہ پھر جان سی پڑ گئی تھی تاکہ وہ انسان کو یہ محسوس کرا سکے کہ وہ ماضی کے ساتھ بہت سے بندھنوں میں بندھا ہوا ہے۔

ماتمی موسیقی کھڑکیوں سے ٹکرا کر گونجتی ہے اور شیشوں کو مرتعش کر دیتی ہے لیکن پھر موسیقی کی آواز اور انسانی آوازوں کی بھنبھناہٹ دونوں پتھروں پر ہزاروں پاؤں کے

ٹکرانے کی آواز میں دب جاتی ہیں۔ قدموں کے نیچے پتھر بہت سخت تھے لیکن زمین مرتعش اور دنیا چھوٹی معلوم ہو رہی تھی اور اس کے اوپر انسانیت کی ایک گاڑھی گاڑھی بو معلق تھی اور آدمی کی نظر بار بار کہر آلود آسمان کی طرف اٹھ رہی تھی جہاں ستارے مدھم مدھم طریقے سے ٹمٹمار ہے تھے۔

لیکن اب دور فاصلے پر ایک اونچی دیوار کی کھڑکیوں کے سیاہ مستطیلوں پر روشنی کا ایک سرخ عکس چمک رہا تھا، ٹمٹماتا تھا، غائب ہو جاتا تھا اور پھر کوندجاتا تھا۔ اور مجمع میں ادھر سے ادھر تک ایک دبی دبی آواز پھیل گئی جیسے جنگل کے کنجوں میں باد بہار گزر جاتی ہے:

''وہ آرہے ہیں...... وہ آرہے ہیں......''

سامنے کی طرف کہیں نئی آوازیں پیدا ہو گئی تھیں اور اب ان کا حجم بڑھ رہا تھا۔ وہ اتنی زیادہ سنجیدہ اور سوگوار آوازیں نہیں تھیں اور وہاں روشنی بھی زیادہ تاباں اور درخشاں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسی عورت نے اپنی چال تیز کر دی ہے اور اس کی رفتار کا ساتھ دینے کے لیے مجمع نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی، یہاں تک کہ سازندے بھی ایک دفعہ اپنے اپنے ساز بجانا بھول گئے اور ایک لمحے کے لیے آہنگ میں خلل پڑ گیا اور موسیقی کی ترتیب بگڑ گئی، ایک جلد باز بانسری نے غلط سر نکال دیا اور اس کی وجہ سے ہر طرف ہنسی کی نرم لہر دوڑ گئی۔

اگلے ہی لمحے، ایک طلسماتی داستان کی طرح غیر متوقع اور اچانک طور پر، ایک چھوٹا سا چوک نمودار ہوا اور اس کے بیچوں بیچ شعلوں اور پھلجھڑیوں سے تابندہ دو پیکر نظر آئے۔ ان میں سے ایک عیسیٰ کا جانا بوجھا، لمبے سفید لباس میں ملبوس، سنہری بالوں والا پیکر اور دوسرا ان کے محبوب حواری یوحنا کا تھا جو نیلا لبادہ پہنے ہوئے تھے۔ ان کے اردگرد سیاہ پیکر ہاتھوں میں مشعلیں لئے کھڑے تھے جن کے جنوبی خدوخال ایک الوہی مسرت کے تبسم سے تابندہ تھے...... ایک ایسی مسرت سے جس کی انہوں نے خود ہی تخلیق کی تھی اور خود ہی اس پر پھولے نہیں سمار ہے تھے۔

عیسیٰ مسیح بھی مگن اور مسرور تھے۔ وہ اپنے ہاتھ میں اپنا آلہ تعذیب لئے ہوئے تھے جو پھولوں سے آراستہ تھا اور دوسرے ہاتھ سے بولتے ہوئے اشارے کرتے جا رہے تھے۔ یوحنا، جواں سال، ڈاڑھی مونچھ صاف اور ایڈونس کی طرح وجیہہ اور طرح دار اپنی لمبی لہریا زلفوں والا سر پیچھے ڈال کر ہنس رہے تھے۔

مجمع چوک میں امنڈ آیا اور اس نے ان دونوں کے ارد گرد ایک حلقہ سا بنا لیا اور وہ عورت ابر آلود رات کی طرح تاریک، گویا اوپر ہوا میں اٹھ کر تیرتی ہوئی سی عیسیٰ مسیح کی طرف چلی۔ ان کے پاس پہنچ کر وہ رکی اور اس نے اپنا ہڈ اتار ڈالا اور اس کی سیاہ چادر کی طرح اس کے پاؤں پر آ رہی۔

تب ٹمٹماتے ہوئے شعلوں کی چنچل اور مسرور روشنی میں گرتے ہوئے ہڈ کے پیچھے سے کنواری مریم کا چمکتا ہوا سنہرا سر نمودار ہوا اور مادر عیسیٰ کے لبادے کے اندر سے اور ان کے قریب والے لوگوں کے ہاتھوں میں سے بیسیوں سفید فاختائیں اپنے پر چمکاتی ہوئی تاریک آسمان کی طرف پرواز کرنے لگیں۔ اور واقعی ایک لمحے کے لیے تو ایسا معلوم ہوا کہ نقرئی تاروں سے چمکتے ہوئے سفید لباس میں ملبوس اور پھولوں کے ہاروں سے لدی ہوئی عورت اور سفید پوش، تقریباً شفاف، عیسیٰ اور نیلے یوحنا...... یہ تینوں آدمی جو اس قدر حیرت انگیز اور غیر ارضی معلوم ہو رہے تھے...... فاختاؤں کے پروں کی جیتی جاگتی پھڑ پھڑاہٹ کے درمیان، گویا ننھے منے فرشتوں سے گھرے ہوئے، سپہر بریں کی سمت پرواز کر گئے ہیں۔ تاریک مجمع کے اندر سے ہزاروں گلوں سے ''گلوریا، میڈونا، گلوریا''[1] کا نعرہ نکلا اور دنیا گویا جادو کے زور سے بدل گئی۔ ساری کھڑکیوں میں روشنیاں چمک اٹھیں، اوپر اٹھے ہوئے بازوؤں نے مجمع کے سروں کے اوپر مشعلیں لہرائیں، ہر طرف سنہری چنگاریاں برسنے لگیں، سنہری، سرخ اور ارغوانی روشنیوں کا طوفان سا ابل پڑا، اوپر کبوتر اڑنے لگے اور سارے چہرے اوپر کی طرف اٹھ گئے اور سب فرط انبساط سے ایک ساتھ چیخے:

---

[1] کنواری مریم کی عظمت و شان! (اڈیٹر۔)

''گلوریا، میڈونا، گلوریا!''

روشنی کی لرزش کے باعث گھروں کی دیواریں بھی لرزنے لگیں اور سب کھڑکیوں میں بچے، لڑکیاں اور عورتیں نمودار ہو گئیں۔ ان کے خوش رنگ تہواری لباس بہت بڑے بڑے شگفتہ پھولوں کی طرح چمک رہے تھے اور نقرئی پوشاک میں ملبوس مریم، جو یوحنا اور عیسیٰ کے بیچ میں کھڑی تھیں، شعلوں میں ملفوف اور پگھلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اب نظر آرہا تھا کہ ان کے خدوخال بڑے بڑے، رنگ سرخ و سفید اور آنکھیں بہت بڑی تھیں، اور ان کے گھنے سنہری بال دو لہراتے ہوئے آبشاروں کی شکل میں ان کے کندھوں پر پڑے ہوئے تھے۔ عیسیٰ شگفتگی سے ہنس رہے تھے جیسا کہ ایک حیات نو پائے ہوئے شخص کے لئے موزوں ہے اور جب یوحنا نے ایک مشعل ہاتھ میں لے کر اسے حرکت دی تو نیلی آنکھوں والی مقدس مریم نے مسکرا کر اپنا سر ہلایا۔ یوحنا ابھی نوعمر ہی تھے، ان میں پرندے کی سی تیز نگاہی اور پھرتی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ وہ شوخی اور دل لگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

تینوں اس کھلے دل سے ہنس رہے تھے جس طرح ایک جنوبی سورج کے نیچے اور مگن اور خوش باش سمندر کے ساحلوں پر رہنے والا ہی ہنس سکتا ہے۔ اور ان کو دیکھ دیکھ کر گرد و پیش کے لوگ بھی ہنس رہے تھے۔ یہ لوگ جو رنگ رلیاں منانے کے فن سے آشنا ہیں جو ہر چیز سے خوبصورتی کی تخلیق کرنے کے ماہر ہیں اور جو خود سب سے زیادہ حسین نظارہ ہیں۔

ظاہر ہے وہاں بچے بھی تھے۔ وہ ان تینوں آدمیوں کے قدموں کے آس پاس اسی طرح منڈلا رہے تھے جس طرح ان کے سروں پر سفید پرندے پرواز کر رہے تھے اور وہ اپنی کھنک دار، مسرور اور پر ہیجان آوازوں میں نعرے لگا رہے تھے۔

''گلوریا، میڈونا، گلوریا!''

بوڑھی عورتیں دعا مانگ رہی تھیں۔ وہ خواب کی طرح حسین و جمیل تثلیث کو دیکھ رہی تھیں اور اگرچہ انہیں خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ پیزا کان محلے کا ایک بڑھئی

عیسیٰ بنا ہوا ہے، گھڑی ساز یوحنا اور کلابتوں کا کام کرنے والی انیتا براگا گلیا مقدس مریم بنی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود وہ دعائیں مانگ رہی تھیں اور اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں سے مقدس مریم کے حضور میں گرمجوشی سے احسان مندی کے الفاظ کہہ رہی تھیں۔ ہر چیز کے لیے اور سب سے بڑھ کر ان کے وجود کے لئے۔

دور سے افسردہ گانے کی آواز آرہی تھی اور پرانے جانے پہچانے گیت کے الفاظ کا خیال آرہا تھا:

''ہم موت کے خاتمے کی خوشیاں منا رہے ہیں۔''

پو پھٹ رہی تھی۔ گرجا کی مزے مزے سے بجتی ہوئی گھنٹیاں یہ اعلان کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ حضرت عیسیٰ، خداوند بہار، زندہ ہو کر آگئے ہیں۔ چوک میں موسیقار ایک جگہ جمع ہو گئے اور موسیقی گونجنے لگی اور اس کی تال پر بہت سے لوگ گرجاؤں کی طرف چلے جہاں ارغنون بھی حیات ثانیہ پائے ہوئے خداوند بہار کی شان میں گیت گا رہے تھے، اور لاتعداد پرندے جو لوگ اس اہم و رسنجیدہ موقع پر اڑانے کے لیے اپنے ساتھ لائے تھے، قبوں کے نیچے اپنے پر پھڑپھڑا رہے تھے۔

یہ بہت ہی شاندار روایت ہے۔ یہ پرندوں کو جو سب سے زیادہ معصوم مخلوق ہیں، انسان کے بہترین جشن کا ساتھی بنانے کی روایت۔ اس ننھی منی پردار مخلوق کو سینکڑوں کی تعداد میں اپنے رنگ برنگے پروں کے ساتھ گرجا کے اوپر اڑتے ہوئے، چہچہاتے ہوئے اور مجسموں اور کارنسوں کے اوپر بیٹھے ہوئے اور تھوڑی دیر بعد قربان گاہ کی طرف اڑتے ہوئے دیکھ کر انسان کا دل ایک خوبصورت ترنم سے لبریز ہو جاتا ہے۔

چوک خالی ہو گیا۔ ان تین تابندہ پیکروں نے کوئی مدھر گیت شروع کر دیا اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سڑک پر چل پڑے ان کے پیچھے موسیقار تھے اور موسیقاروں کے پیچھے مجمع۔ ان سب کے پیچھے پیچھے بچے بھاگتے ہوئے آئے۔ تہوار کے موقع کی رنگا

رنگ روشنیوں میں بچے اپنی لڑی سے ٹوٹے ہوئے مونگے کے موتیوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ اور کبوتر چھتوں کے اوپر اور چھجوں پر بیٹھے غٹرغوں کر رہے تھے۔

اور ایک دفعہ پھر اس پرانے جانے پہچانے گیت کے الفاظ سنائی دیئے:

"عیسیٰ زندہ ہو گئے ہیں......"

اور ایک دن ہم سب مردوں سے زندہ ہو جائینگے اور فنا کو شکار فنا کر دیں گے۔

میکسم گورکی

یسوع مسیح کی پیدائش

آدھی رات ہونے والی ہے۔

نیچے نیچے بادل چھوٹے سے کاپری چوک کے اوپر نیلے آسمان کے آر پار لپکتے جھپکتے پھر رہے ہیں اور ستاروں سے بنے ہوئے مختلف تابندہ ڈیزائنوں کی جھلک دکھا رہے ہیں۔ نیلگوں ستارہ شعرائے یمانی ایک دم ٹمٹماتا ہے اور پھر مدھم پڑ جاتا ہے اور چرچ کے کھلے دروازے سے ارغنون کی گہری اور گونج دار آواز آ رہی ہے۔ اور یہ سب ...... بھاگتے ہوئے بادل، ٹمٹماتے ہوئے لرزاں ستارے، عمارتوں کی دیواروں اور چوک کے پتھروں کے اوپر متحرک سائے ...... مدھر سنگیت کی طرح ہے۔

اور اس سنگیت کے ترنم کے ساتھ ساتھ پورا چوک تھیٹر کی سینری کی طرح لرز رہا ہے اور کبھی تنگ و تاریک معلوم ہونے لگتا ہے تو کبھی کشادہ اور روشن۔

مانٹی سولیارو کے اوپر ''سات سہیلیوں کا جھومکا'' اپنا شان دار حسن بکھیر رہا ہے۔ پہاڑ کی چھوٹی پر ایک سفید بادل درخشاں تاج کی طرح رکھا ہوا ہے اور پہاڑ کے ڈھلوان پہلو جن میں جا بجا شگاف پڑے ہوئے ہیں کسی تاریک اور قدیم چہرے سے مشابہ ہیں جس پر دنیا اور انسانیت کے متعلق بلند و بالا خیالات نے شکنیں ڈال رکھی ہوں۔

وہاں، چھ سو میٹر کی بلندی پر، ایک چھوٹی سی، غیر آباد اور غیر مستعمل خانقاہ

ہے، جسے اس وقت ایک بادل نے چھپا رکھا ہے اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا قبرستان ہے جس میں قبریں کیاریوں کی قطاروں کی طرح بنی ہوئی ہیں اور ان کے اندر ان سب راہبوں کے جسم میں جو کبھی وہاں رہتے تھے۔ بعض دفعہ خانقاہ کی بھوری دیواریں بادلوں کے پیچھے سے جھانکنے لگتی ہیں گویا نیچے جو کچھ ہو رہا ہے اس کی سن گن لینا چاہتی ہوں۔

بچوں کی شور وغل مچاتی ہوئی ٹولیاں چوک میں ادھر سے ادھر بھاگ رہی ہیں اور پٹاخے چھوڑ رہی ہیں۔ آگ کے شعلے زبانیں نکالے فضا میں لپک رہے ہیں اور پتھروں کے اوپر کروڑوں لال لال چنگاریاں بکھیر رہے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی بے باک ہاتھ ایک جلا ہوا پٹاخہ خوب اوپر تک اچھال دیتا ہے اور وہاں وہ ایک سہمی ہوئی چمگادڑ کی طرح گھومتا اور سسیاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے، تاریک پیکر ہنستے اور چیختے چلاتے ہر طرف پھر رہے ہیں، ایک زور کا دھماکا آتش بازی چھٹنے کا ہوتا ہے اور ایک لمحے کے لیے اس روشنی کی کوند میں کونوں میں دبکے ہوئے بچوں کے پیکر چمک اٹھتے ہیں اور اندھیرے میں ان کی روشن آنکھیں چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

آتش بازی چھٹنے کے دھماکے تقریباً مسلسل ہو رہے ہیں اور وہ قہقہوں، خوف کی چیخوں اور گونج پیدا کرنے والے لاوا کے اوپر لکڑی کی کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ سب کو دبا لیتے ہیں۔ سائے لرزتے ہیں اور اچھلتے ہیں، آتش بازی کے تیز اور روشن عکس سے بادل چمک اٹھتے ہیں اور گھروں کی پرانی دیواریں مسکراتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں بوڑھوں کا بچپن یاد ہے اور یہ مزے دار اور ذرا خطرناک کھیل جو بچے کرسمس کی شام کو کھیلتے ہیں انہوں نے متعدد بار دیکھا ہے۔

لیکن جوں ہی خاموشی ہوتی ہے، خواہ ایک ہی لمحے کے لئے کیوں نہ ہو، ارغنون کی سنجیدہ اور مناجاتی بانگ سنائی دینے لگتی ہے اور نیچے سے سمندر جواب میں اپنی ساحل کے پتھروں سے سر ٹکراتی ہوئی موجوں کی گھٹی گھٹی چنگھاڑ اور سنگریزوں کی ریشمی سرگوشیاں بھیجتا ہے۔

خلیج ایک سیاہی مائل، جھاگ دار شراب سے لبریز پیالے سے مشابہ ہے ور

اس کے کنارے پر شہر کی روشنیاں جگمگا رہی ہیں...... خلیج کا بیش بہا موتیوں سے بنا ہوا ہار۔

نیپلس کے اوپر آسمان بدلتے ہوئے رنگوں کی جوت سے منور ہے جو شمالی قطب کی روشنی کی مانند ٹمٹما رہی ہے، درجنوں ہوائیاں اور لرزتے ہوئے شعلے اس کے اندر گھس پڑتے ہیں اور رنگ برنگی روشنیوں کے گلدستوں کی شکل اختیار کر کے لمحے بھر کو روشنی کے ایک لرزاں بادل میں معلق رہتے ہیں اور پھر ایک گڑگڑاہٹ کی آواز نکال کر بجھ جاتے ہیں۔

خلیج کا پورا نیم دائرہ اس خوبصورت آتش بازی سے بھرپور ہے۔ نیپلس کے بندرگاہ کا سفید راہ نما مینار ٹھنڈے انداز میں [illegible] دے رہا ہے اور کاپودی میزینا کی سرخ آنکھ چمک رہی ہے۔ لیکن پروسیدا کی اور لیسکیا کے دامن کی روشنیاں رات کے سیاہ مخمل میں ٹکے ہوئے بڑے بڑے ہیروں کی قطاروں سے مشابہ ہیں۔

خلیج پر لاتعداد لہریں اٹھ رہی ہیں اور ان کی سریلی چھپ چھپاہٹ دور فاصلے پر ہوتے ہوئے دھماکوں کی گرج کو دبا دیتی ہے۔ ارغنون ابھی تک بج رہا ہے اور بچے ہنس رہے ہیں۔ لیکن اچانک گھنٹہ گھر کا گھنٹا پہلے چار دفعہ اور پھر بارہ دفعہ بجتا ہے۔

نماز ختم ہوئی۔ مجمع ایک رنگا رنگ دھارے کی شکل میں گرجا کے دروازے سے باہر نکل کر ان چوڑی چوڑی سیڑھیوں کی طرف آتا ہے جہاں لال پٹاخے اچھل رہے ہیں اور بل کھا رہے ہیں۔ عورتیں ڈر کر ہلکی ہلکی چیخیں مارتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے لڑکے مارے خوشی کے قہقہے لگاتے ہیں۔ یہ ان کا تہوار ہے اور آج کی رات کوئی انہیں اس سرخ آگ سے کھیلنے کو منع کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

واقعی کسی تہواری لباس پہنے ہوئے متین اور بھاری بھرکم بڑے آدمی کو ڈرانے اور اس مطلق العنان شخص کو چوک میں کودوانے اچھلوانے میں کتنا مزا آتا ہے جب وہ اپنے پیچھے بھاگتے اور زور زور سے سیاتے ہوئے پٹاخے سے بچنے کے لیے ادھر سے ادھر مڑے اور بل کھائے اور اس کے جوتوں پر چنگاریاں ناچتی ہوئی ہوں تو کیا کہنا! اور یہ

سال میں بس ایک ہی دفعہ ہوسکتا ہے......

یسوع کے یوم ولادت کے موقع پر، جو بچوں سے محبت کرتے تھے، بچے اپنے آپ کو زندگی کے فرماں روا اور بادشاہ محسوس کرتے ہیں اور وہ تفریح اور خوش باشی کے ان چند لمحوں کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اس بات کے لئے اٹھاتے ہیں کہ بالغوں سے ان کی سال بھر کی ناخوش گوار حکومت اور جبر کا بدلہ نکال لیں۔ اور جب بڑے آدمی آگ سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے بھونڈے طریقے سے اچھلتے کودتے ہیں اور خوش طبعی سے بچوں سے امان مانگتے ہیں: ''بس! ارے ننھے بدمعاشوں بس!'' تو بچے کیسا کیسا خوش اور محظوظ ہوتے ہیں!

اب زامپونیاری آتے ہیں...... آبروزی کے گلہ بان...... وہ چھوٹے نیلے لبادوں میں ملبوس اور چوڑے چھجے کے ہیٹ اوڑھے ہوئے پہاڑی لوگ ہیں جن کی سڈول ٹانگوں پر سفید اونی موزے چڑھے ہوئے ہیں اور ان پر سیاہ تسمے آڑے ترچھے لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو آدمی اپنے لبادوں کے نیچے بین لئے ہوئے ہیں اور چار آدمیوں کے پاس نفیریاں ہیں جن میں باریک اور بلند آوازیں نکل رہی ہیں۔

یہ لوگ ہر سال جزیرے میں آتے ہیں اور پورے ایک مہینے یہاں رہتے ہیں اور اپنے خوبصورت اور انوکھے سنگیت کے ذریعے خداوند مسیح اور مقدس مریم کی تعریف کرتے ہیں۔

جب یہ لوگ طلوع آفتاب کے وقت اپنے ہیٹ پاؤں پر رکھے کنواری مریم کے مجسمے کے سامنے کھڑے ایک جذبہ پرستش کے ساتھ یسوع کی ماں کی پر شفقت چہرے پر نظریں جمائے ہوتے ہیں اور ان کے لئے اپنا انتہائی موثر نغمہ شیریں بجاتے ہیں...... جسے کسی نے ایک دفعہ بہت ہی موزوں اور چسپاں نام دیا تھا: ''خدا کے وجود کا جسمانی احساس''......اس وقت انہیں دیکھ کر دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔

اس وقت گلہ بان بوڑھے بڑھئی، پاؤلینو کے گھر سے ناند میں سے ننھے یسوع کو نکال کر سینٹ تھیریسا کے چرچ لے جانے کے لئے جلدی جلدی جا رہے ہیں۔

بچے ان کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ تنگ سڑکیں ان کے سیاہ سایوں کو ہڑپ کر جاتی ہیں۔ اور چند منٹ کے اندر اندر چوک خالی ہو جاتا ہے۔ سوائے اس کے کہ چرچ کی سیڑھیوں پر ایک مختصر سا مجمع جلوس کے انتظار میں کھڑا ہوا ہے اور بادلوں کے گرم سائے عمارتوں کی دیواروں اور لوگوں کے سروں پر اس طرح آہستہ آہستہ متحرک ہیں جیسے انہیں پیار کر رہے ہوں۔

سمندر ٹھنڈا سانس بھرتا ہے۔ خاکنائے پر دور کہیں اندھیرے میں ایک صنوبر کا درخت، ایک نازک ساق والے بڑے سے گلدان کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ شعرائے یمانی میں اب خیرہ کن تابندگی آ گئی ہے۔ مانٹی سولیارو پر منڈلاتا ہوا بادل غائب ہو گیا ہے اور چٹان کے سرے پر ایستادہ چھوٹی سی یکہ وتنہا خانقاہ اور اس کے اوپر پہرہ دار کی طرح کھڑا ہوا اکیلا درخت اب صاف نظر آ رہے ہیں۔

گلہ بانوں کے گیت سڑک کی محراب کے اندر سے آواز کی روشن اور درخشاں لہروں کی طرح نکل رہے ہیں۔ یہ ننگے سروں اور مڑی ہوئی ناکوں والے لوگ، اپنے تاریک لبادوں میں دیوقامت پرندوں سے مشابہ، بچوں کے ایک ہجوم میں گھرے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ وہ لمبے لمبے بانسوں پر لالٹینیں لئے ہوئے ہیں، لالٹینیں ہوا میں جھوم رہی ہیں اور بوڑھے پاؤلینو کے مختصر اور گول گول جسم اور نقرئی سر کو، اس پھولوں سے بھری ہوئی ناند کو جو وہ اپنے ہاتھوں میں لئے ہوئے ہے اور مسکراتے ہوئے ننھے عیسٰی کے گلابی جسم کو جو اس کے دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھوں میں لیٹا ہوا ہے، روشن کر رہی ہیں۔

بوڑھا اس مٹی کی مورتی کو اس قدر پرستشانہ نظروں سے دیکھ رہا ہے جیسے وہ واقعی زندہ ہو اور سورج نکلنے کے وقت "دنیا کو امن اور انسانوں کو مہربانی اور خیر خواہی" عطا کرنے والی ہو۔

سفید بالوں والے ننگے سر اور سنجیدہ چہرے ہر طرف سے ناند کی جانب جھک رہے ہیں اور محبت کی روشنی سے منور آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ آتش بازی

چھٹ رہی ہے اور اس کی وجہ سے چوک میں سے تاریکی اس طرح غائب ہو جاتی ہے جیسے ایک دم سورج طلوع ہو گیا ہو۔ بچے ہنستے اور چیختے اور گاتے ہیں، بڑے آدمی لطف آمیز طریقے سے مسکراتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر انہیں بچوں کے سامنے بے وقار اور اوچھے معلوم ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ بھی مارے خوشی کے اچھلنے کودنے اور چیخنے چلانے کو تیار ہو جاتے۔

شمعوں کی زردہ روشنیاں سنہری پروانوں کی طرح مجمع کے اوپر لرز رہی ہیں اور ان کے اوپر گہرے نیلے آسمان میں ستارے جگمگا رہے ہیں۔ ایک دوسری سڑک سے ایک اور جلوس آ رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں کنواری مریم کا مجسمہ لئے ہوئے ہیں۔ اور اب روشنی، موسیقی، خوشی کی چیخیں اور بچوں کے قہقہے اور بھی بڑھ گئے ہیں۔ ہر آدمی پر پوری طرح ایک تہواری کیفیت طاری ہے۔

لوگ ننھے عیسیٰ کو پرانے گرجا میں لے جاتے ہیں۔ وہاں بہت عرصے سے عبادت نہیں ہوتی اور سال بھر وہ خالی پڑا رہتا ہے۔ لیکن آج اس کی قدیم دیواریں پھولوں اور کھجور کے پتوں، سنہری لیموؤں اور سنگتروں سے آراستہ ہیں اور اس کا پورا اندرونی حصہ ولادت مسیح سے متعلق ایک بڑی چابک دستی سے بنائی ہوئی تصویر سے ڈھکا ہوا ہے۔

پہاڑ، غار، بیت المقدس اور پہاڑ کی چوٹیوں پر واقع عجیب و غریب قسم کے قلعے ڈاٹ کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے بنائے گئے ہیں، پہاڑ کی ڈھلانوں پر ایک سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی جا رہی ہے اور مرغزاروں پر بھیڑیں اور بکریاں چر رہی ہیں، شیشے کے ٹکڑوں سے چمکتے آبشار بنائے گئے ہیں، گلہ بانوں کی ایک ٹولی کھڑی ہوئی آسمان کی طرف دیکھ رہی ہے جہاں ایک سنہری ستارہ تابندہ ہے، فرشتے آسمان پر مصروف پرواز ہیں اور ایک ہاتھ میں بیت المقدس کے ستارے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور دوسرے سے اس غار کی جانب جہاں مقدس ماں اور یوسف اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی سمت اٹھائے ننھے عیسیٰ نظر آ رہے ہیں۔ ساحروں اور

بادشاہوں کا ایک رنگین قافلہ بھڑک دار لباس پہنے غار کی طرف بڑھ رہا ہے اور ان کے سروں کے اوپر فرشتے کھجور کے پتے اور گلاب ہاتھوں میں لئے ہوئے اڑ رہے ہیں۔ شوخ ریشمی لبادوں میں ملبوس لمبی ڈاڑھیوں والے مغان شتر سوار اور مصنوعی بالوں کی ٹھاٹ دار ٹوپیاں اوڑھے اور بیش قیمت اطلس اور کمخواب میں ملفوف سنہری بالوں والے گھوڑ سوار بادشاہ، گھونگریالے بالوں والے نومیدین، عرب، یہودی اور سینکڑوں دوسرے رنگین اور انوکھے انوکھے کپڑوں میں ملبوس مٹی کے مجسمے موجود ہیں۔

اور ناند کے چاروں طرف سفید چوغوں میں ملبوس عرب اپنی دکانیں کھولے بیٹھے ہیں اور موم کی مٹھائیاں، ریشمی کپڑے اور اسلحہ بیچ رہے ہیں اور ان کے علاوہ کچھ لوگ جن کی نسل و قومیت کا کسی کو علم نہیں شراب فروخت کر رہے ہیں، عورتیں پانی کی گاگریں کاندھوں پر رکھے کنویں کی طرف جارہی ہیں، ایک کسان ایک گدھے کو ہانک رہا ہے جس پر جھاڑیاں لدی ہوئی ہیں۔ بہت سے لوگ ننھے عیسیٰ کے سامنے دوزانو ہیں۔ اور بچے، ہر طرف بچے......

یہ تمام تفصیلات اس قدر فنی مہارت اور چابک دستی سے پیش کی گئی ہیں کہ پوری تصویر آواز اور حرکت سے بھرپور اور جیتی جاگتی معلوم ہوتی ہے۔

بچے تصویر کے سامنے کھڑے ہوئے بڑے غور سے اس کا جائزہ لے رہے ہیں اور ان کی ننھی ننھی تیز آنکھیں فوراً ہر اس نئی تفصیل کو دیکھ لیتی ہیں جس کا پچھلے سال کے بعد اضافہ ہوا ہے، وہ جلدی جلدی اپنی ہر نئی دریافت ایک دوسرے کو بتاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہنستے، چیختے اور بحث کرتے جاتے ہیں۔ اور قریب کھڑے ہوئے پرفخر فنکاران ننھے مبصروں کی تعریفوں کو سن کر خاصے خوش ہو رہے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ وہ بڑے آدمی ہیں، بچوں کے باپ ہیں اور ان کی سنجیدگی انہیں کھیل کود کی چیزوں میں دل چسپی لینے کی اجازت نہیں دیتی اور وہ یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ان چیزوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ لیکن بچے اکثر بڑوں سے زیادہ عقل مند ہوتے ہیں اور ہمیشہ زیادہ مخلص۔ وہ جانتے ہیں کہ بوڑھے آدمی بھی اپنی تعریف سننا پسند

کرتے ہیں اور اسی لئے وہ خوب دل کھول کر تعریفیں کر رہے ہیں اور فنکار اپنی خوشی کی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے اپنی ڈاڑھیوں اور گل مچھوں کو تھپک رہے ہیں۔

ادھر ادھر بچے ٹولیاں بنا کر آپس میں سنجیدگی سے کچھ مشورے کر رہے ہیں۔ وہ ''طائفے'' بنا رہے ہیں اور سال نو کی شام کو وہ کرسمس کا درخت اور ستارہ لے کر پورے جزیرے میں گھر جائیں گے اور پرانے پرانے سازوں کی پرشور ہم نوائی میں وہ مزے دار اور پرلطف نیم مذہبی گیت گائیں گے جو مقامی شاعر ہر سال اسی موقع کے لئے لکھتے ہیں۔

سال نو مبارک ہو

سینور اور سینورا کو!

سنئے سنئے آپ کے ننھے دوست

آپ کے لیے خوش خبریاں لائے ہیں!

کان اپنے کھولئے، دل بھی اپنے کھولئے

بٹوے بھی کھول ہی ڈالئے:

آج یوم جشن ہے،

آج یوم عید ہے، آج ہے عیسیٰ کا دن!

ہمارے مسیحا ننگے اور غریب

اس دنیا میں آئے۔

اور اپنے نرم و گرم سانسوں کے ذریعے

بیلوں نے انہیں حرارت پہنچائی۔

اور ہمیں سارے دکھ درد سے نجات دلانے کے لئے

انہوں نے اپنی جان کی قربانی دی۔

اور انہوں نے اپنی تمام زندگی

ہم غریبوں کے لئے وقف کر دی۔

عیسیٰ مسیح کی شان میں گائیں گے آج ہم
گائیں گے اور خوشیاں منائیں گے آج ہم
یوم مسیح کو یوم مسرت بنائیں گے آج ہم
ناچیں گے مل کے آج سبھی اور گائیں گے!......

اور جس وقت بچوں کی ایک ٹولی یہ نیم مذہبی ترانہ گاتی اور اسکے دھن پر ناچتی ہے تو ایک دوسری ٹولی اسے ایک اور بھی زیادہ مدھر اور اور مزے دار گیت کی آواز میں ڈبو دیتی ہے:

یاد کیجئے کس طرح وہ گلہ بان
اور بادشاہ اور ساحر
سب کے سب ننھے عیسیٰ کی ناند کے سامنے
دوزانو ہو گئے!

بوم! بوم! ڈھول بجتے ہیں اور کوئی باریک آواز والی بانسری بچوں کے گانے کا ساتھ نہیں دے سکتے اور گویا فریادی سے انداز میں مضحکہ خیز طریقے سے ان کے پیچھے پیچھے آواز نکالتی ہے:

اور بدطینت بادشاہ ہیرود نے
جو ننھے عیسیٰ سے ڈرتا تھا
سارے ننھے لڑکوں کو
جان سے مروا دیا!
لیکن یہ اب پرانا قصہ ہو گیا
ہیرود مر گیا اور ہم زندہ ہیں،
اور آج کے دن مرغی اور مرغے کے سواء
اور کسی کو جان سے نہیں مارا جاتا!

بڑے آدمیوں کے لئے بھی اس مسرت بھرے گیت کی دھن کو سن کر خاموش

رہنا مشکل ہے اور اب موٹا گاڑی بان کارلو بمبولا مٹکتا ہوا سا بچوں کی طرف بڑھتا ہے اور اپنی پوری آواز سے گانے لگتا ہے اور بچوں کی آواز اس کی آواز میں ڈوب جاتی ہے۔ اس کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے:

ساری فکروں کو بھگا دو،
سارے غموں کو بھلا دو۔
ہمیں کوئی روگ نہیں ستائیگا،
ہم تک کوئی دکھ نہیں آئے گا!
دیکھو دیکھو سپہر بریں پر
جھلملاتے ستاروں کا جلوہ تو دیکھو!
کاش جیون ہمارا بھی ایسا ہی روشن
اور اتنا ہی گرم ہو!

بچوں کو دیکھتے ہوئے عورتوں کی سیاہ آنکھوں میں ایک تصورات کی دنیا آباد ہو جاتی ہے، تفریح اور قہقہے چہچہے بڑھتے جاتے ہیں، چہرے دمکنے لگتے ہیں۔ اپنے اپنے تہواری جوڑے پہنے لڑکیاں لڑکوں پر مسکراہٹ بکھیر رہی ہیں۔ ستارے چھپ رہے ہیں۔ اور کہیں اوپر کی طرف سے...... کسی چھت یا کھڑکی میں سے...... ایک کھنک دار اور بلند مردانی آواز سنائی دیتی ہے:

تندرست رہو اور مسرور اور مگن
اور سب کچھ ٹھیک رہے گا!

پرانے گرجا میں بچوں کی ہنسی...... دھرتی کی سب سے زیادہ مدھر موسیقی...... زیادہ سے زیادہ گونجتی جا رہی ہے۔ جزیرے کے اوپر کا آسمان پیلا پڑ گیا ہے۔ طلوع آفتاب قریب ہے۔ ستارے آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں زیادہ سے زیادہ پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں۔

جزیرے کے سبز کاہی باغوں میں سنہری سنترے چمک رہے ہیں، زرد لیموں

بہت بڑے بڑے الوؤں کی آنکھوں کی طرح اندھیرے کے اندر سے جھانک رہے ہیں۔ زردی مائل سبز رنگ کے نوخیز پتے سنترے کے درختوں کی پھنگوں کو روشن کئے ہوئے ہیں، زیتون کے پتے چاندی کی طرح چمک رہے ہیں اور انگور کی بیلوں کی ننگی شاخیں لرز رہی ہیں۔

شوخ رنگ کارنیشن اور ساج کی سرخ ڈالیاں طلوع آفتاب کے سواگت میں مسکرا رہی ہیں۔ نرگس کی تیز خوشبو سمندر کے نمکین سانس کے ساتھ ملی ہوئی صبح کی تازہ ہوا کے اوپر تیر رہی ہے۔

لہروں کے ساحل سے ٹکرانے کی آواز تیز تر ہوگئی ہے، وہ اب بالکل شفاف ہیں اور ان کا جھاگ برف کی طرح سفید ہے۔

میکسم گورکی

گیووانی / سوشلسٹ

ایک پرانے انگوروں کے باغ کے گنجان کنج میں چھپے ہوئے سفید کانٹینا [1] کے دروازے کے پاس دو آدمی، مکانوں پر سفیدی کرنے والا وینسیزو اور مستری گیووانی ایک شراب کا جگ لئے بیٹھے ہیں۔ انگوروں کی بیلوں اور شاخ پیچاں اور ننھے ننھے چینی گلاب کے پودوں کے آپس میں گتھ جانے سے جو شامیانہ سا بن گیا تھا ان کی میز اس کے نیچے رکھی ہوئی ہے۔ سفیدی کرنے والا ایک پستہ قد، سانولا اور دبلا آدمی ہے۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک ملائم مسکراہٹ کا شعلہ رقصاں رہتا ہے جو اس کے خوابوں کی نگری کا باسی ہونے کا شاہد ہے۔ اور اس کے ڈاڑھی مونچھ صاف گالوں اور اوپری ہونٹ کے گہرے نیلے سے رنگ کے باوجود یہ مسکراہٹ اس کے چہرے کو ایک طفلانہ سادگی اور معصومیت عطا کرتی ہے۔ اس کی انگلیاں لمبی لمبی ہیں اور اس کا دہن چھوٹا، خوبصورت اور لڑکیوں جیسا ہے۔ اس کی بے چین انگلیاں ایک سنہری شگوفے سے کھیل رہی ہیں۔ وہ اسے اپنے بھرے بھرے ہونٹوں سے لگاتا ہے اور اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

"ممکن ہے" وہ دھیرے سے کہتا ہے "میں نہیں جانتا۔" وہ اپنا لمبا اور پتلا سر ہلاتا ہے اور اس کے سرخی مائل بالوں کی لہریا لٹیں اس کی اونچی پیشانی پر آن پڑتی ہیں۔

---

[1] زمین دوز معمولی قسم کا شراب خانہ۔

''ہاں، ہاں! جتنے زیادہ شمال کی طرف جاؤ اتنے ہی زیادہ مستقل مزاج لوگ ملتے ہیں!'' گیوانی نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ وہ ایک بڑے سے سر، چوڑے شانوں اور گھونگر والے سیاہ بالوں والا نوجوان ہے۔ اس کا چہرہ تانبے کے رنگ کا ہے، اس کی سورج میں تمتمائی ہوئی ناک پر کھپرے اترتی ہوئی کھال کی ایک پرت دار سفید تہ ہے، اس کی آنکھیں بڑی بڑی، نرم اور پر شفقت ہیں۔ اس کے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا غائب ہے۔ اس کی گفتگو میں اس کے ہاتھوں کی جنبش کی طرح، جو مشین کے تیل اور فولاد کے برادے سے بری طرح بھرے ہوئے ہیں، آہستگی اور ٹھیراؤ ہے۔ وہ اپنی ٹوٹے ہوئے ناخنوں والی سانولی انگلیوں میں اپنا شراب کا جام زور سے پکڑے ہوئے ہے اور ایک گہری آواز میں اپنی بات جاری رکھتا ہے:

''میلان، تیورین...... یہ بہت ہی عمدہ کارخانے ہیں جہاں نئے انسانوں کی تخلیق ہو رہی ہے، جہاں ایک نئی ذہنیت پیدا ہو رہی ہے! ذرا انتظار کرو، بہت دن نہیں جاتے کہ یہ دنیا ایمان دار اور عقل مند ہو جائے گی!''

''ہاں'' مختصر وینیسنزو نے کہا اور سورج کی شعاعوں کو پکڑنے کے لئے اپنا جام اوپر اٹھاتے ہوئے گانا شروع کر دیا:

ہمارے زمانے کی صبحوں کو دھرتی کس
قدر گرم ہوتی تھی،
لیکن جب ہم بوڑھے ہو گئے تو دھرتی ہمارے لئے ٹھنڈی ہے۔

''میں کہتا ہوں کہ جتنے زیادہ شمال کی طرف جاؤ، کام اتنا ہی اچھا ہوتا جاتا ہے۔ فرانسیسی ہماری طرح سست نہیں ہیں، اس کے بعد جرمن آتے ہیں اور پھر آخر میں روسی...... وہ ہیں تو زوردار لوگ؟''

''ہاں!''

''ان مظلوم اور کچلے ہوئے لوگوں نے اپنی جان اور آزادی کی بازی لگا کر بڑے بڑے کارنامے انجام دئے ہیں۔ یہ انہیں کا طفیل ہے کہ پورے مشرق میں زندگی

کی لہر دوڑ گئی ہے!''

''سور ماؤں کا دیش!'' وینیسنز و نے اپنا سر جھکاتے ہوئے کہا''کاش میں وہاں رہتا......''

''تم!'' مستری اپنے گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے چلایا''تم تو وہاں ایک ہفتے کے اندر برف کی سل بن کر رہ جاتے!''

دونوں دل کھول کر ہنسے۔

ان کے اردگرد نیلے اور سنہری پھول کھلے ہوئے تھے، سورج کی کرنیں فضا میں مرتعش تھیں، شیشے کے گلاس میں الماندین شراب چمک رہی تھی اور دور سے سمندر کی سرگوشیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

''اچھا اب سنو وینیسنز و، میرے دوست'' گیووانی نے کھیسیں نکال کر کہا ''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں سوشلسٹ کیسے بنا۔ اور تم اس کو شعر کی شکل دینا۔ تمہیں معلوم ہے یہ کہانی؟''

''نہیں'' وینیسنز و نے جام میں شراب انڈیلتے ہوئے اور اس لال دھارے کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔''تم نے مجھے کبھی نہیں سنائی۔ تمہاری یہ کھال تمہاری ہڈیوں پر اتنی اچھی طرح چپکی ہوئی ہے کہ میرا خیال تھا تم اسے ساتھ لے کر پیدا ہوئے تھے!''

''میں تمہاری اور باقی سب لوگوں کی طرح ننگا اور بیوقوف پیدا ہوا تھا۔ اپنی جوانی کے زمانے میں میں کسی امیر عورت سے شادی کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ جب میں فوج میں تھا تو بہت محنت کیا کرتا تھا تاکہ افسر بن سکوں۔ میری عمر اس وقت تیس سال کی تھی جب میں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ اس دنیا میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک نہیں ہے اور بے وقوفی کی زندگی گزارنا بڑی شرم کی بات ہے!''

وینیسنز و نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکالیں، اپنا سر اٹھایا اور پہاڑی کو اور اس کی چوٹی پر کھڑے ہوئے صنوبر کے بڑے بڑے درختوں کو تکنے لگا جو اپنی شاخیں ہلا رہے تھے۔

''میرے دستے کو بولونا بھیجا گیا۔ وہاں کسان کچھ گڑ بڑ کر رہے تھے، ان میں سے بعض لگان میں کمی کرانا چاہتے تھے اور بعض اجرت میں اضافے کی مانگ کر رہے تھے۔ میرے خیال میں لگان گھٹانا اور اجرت بڑھانا بڑی حماقت تھی۔ اس طرح تو زمین دار بالکل تباہ ہو جائیں گے! مجھ جیسے شہر کے رہنے والے شخص کو یہ سب بیوقوفی اور پاگل پن کی بات معلوم ہوتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ گرمی اور روز روز کے ادھر سے ادھر مارے مارے پھرنے اور رات کے وقت کی سنتری کی ڈیوٹی ان سب چیزوں کی وجہ سے میں بہت خفا تھا۔ اور یہ سور مازمین داروں کی مشینوں کو توڑ پھوڑ رہے تھے، اناج میں آگ لگا رہے تھے اور ہر اس چیز کو جو ان کی ملکیت نہیں تھی تباہ و برباد کر رہے تھے۔''

اس نے آہستہ آہستہ شراب کی چسکی لگائی اور پہلے سے بھی زیادہ گرما کر اپنی تقریر جاری رکھی:

''وہ لوگ ایک دوسرے سے لگے لگے، بھیڑوں کی طرح، کھیتوں کی طرف جاتے تھے۔ مگر خاموش اور آزردہ خاطر۔ ہم اپنی سنگینیں دکھا دکھا کر انہیں منتشر کر دیتے تھے اور کبھی کبھی انہیں اپنی رائفلوں کے کندوں سے دھکیل بھی دیتے تھے۔ لیکن وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوتے تھے، وہ آہستہ آہستہ منتشر ہوتے تھے اور پھر جمع ہو جاتے تھے۔ یہ سب قصہ پادری کی روں روں کی طرح اکتا دینے والا تھا اور بخار کی طرح گھسٹتا ہی چلا گیا۔ ہمارے کارپورل لولاٹو کو، جو آبروزی کا رہنے والا ایک شریف شخص تھا اور خود بھی کسان ہی تھا، اس سارے قصے سے بڑی تکلیف اور کوفت ہوتی تھی۔ وہ دبلا اور خستہ حال ہو گیا اور بہت ہی دکھیا سا دکھائی دینے لگا۔

''بچو یہ بہت بری بات ہے!، وہ کہتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی رائفلیں استعمال کرنی پڑیں گی، لعنت ہو اس قصے پر!،

''اس کے اس جھینکنے نے ہمیں اور بھی پریشان کر دیا تھا اور اس پر طرہ یہ کہ وہ سر پھرے، بے وقوف کسان ہر ہر کونے میں، ہر ہر پہاڑی پر اور ہر ہر درخت کے آس پاس پھرتے رہتے تھے اور ہمیں نفرت بھری اور قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ قدرتی

بات ہے کہ ان کے دل میں ہمارے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔''

''شراب پیو!'' پستہ قد وینیسنزو نے اپنے دوست کی طرف ایک لبریز جام سرکاتے ہوئے کہا۔

''شکریہ۔ اور یہ مخلص اور سرگرم انسانوں کا جام صحت ہے!'' گیووانی چلایا۔ وہ غٹا غٹ پورا جام چڑھا گیا، ہاتھ سے اپنی مونچھوں کو پونچھا اور پھر بات شروع کر دی:

''ایک دن میں ایک زیتون کے درختوں کے کنج کے قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑا درختوں کی حفاظت کر رہا تھا۔ کیونکہ کسانوں کو جب کبھی بھی موقع ملتا تھا انہیں برباد کر ڈالتے تھے۔ دو کسان، ایک بوڑھا اور ایک جوان، پہاڑی کے دامن میں ایک خندق کھود رہے تھے۔ بہت شدید گرمی ہو رہی تھی اور سورج آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ یہ ایک ایسا دن تھا جب آدمی سوچتا ہے کہ کاش میں مچھلی ہوتا! میں اکتاہٹ اور جھلاہٹ کے احساس کے ساتھ انہیں کام کرتے دیکھتا رہا۔ دوپہر کے وقت انہوں نے کام سے ہاتھ روک لئے اور کچھ روٹی اور پنیر اور ایک شراب کا جگ نکالا۔ خدا کی مار ہو تم پر، میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اچانک اس بوڑھے نے، جس نے اس وقت تک ایک دفعہ بھی میری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا، لڑکے سے کچھ کہا۔ لڑکے نے سر ہلایا اور بوڑھے نے چیخ کر سخت لہجے میں کہا:

''جاؤ، جاؤ!''

''نوجوان جگ لئے ہوئے میرے پاس آیا اور کچھ ناگواری سے کہا:

''میرے باپ کا خیال ہے کہ تم پیاسے ہو اور اس نے تمہیں شراب بھیجی ہے!''

''یہ چیز گھبرا دینے والے تو ضرور تھی لیکن خوش گوار بھی تھی۔ میں نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا اور بوڑھے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن بوڑھے نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا:

''پی لو، سینیور، پی لو! ہم یہ شراب انسان کو پیش کر رہے ہیں سپاہی کو نہیں۔

ہمیں یہ توقع نہیں ہے کہ ہماری شراب سپاہی کے دل میں نیکی ڈال سکتی ہے۔"

"چٹکیاں لینے کی ضرورت نہیں ہے، لعنت ہو تم پر!، میں نے اپنے دل میں کہا۔ اور شراب کا ایک گھونٹ لے کر ان کا شکریہ ادا کیا اور وہ لوگ بیچ کھانے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد ہیوگو...... وہ سالیونو کا رہنے والا تھا...... مجھ سے ڈیوٹی بدلنے کے لئے آ گیا اور میں نے اس کو بتایا کہ یہ دونوں کسان صحیح قسم کے لوگ ہیں۔ اس روز شام کو جب میں اس سائبان کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا جہاں مشینیں رکھیں جاتی ہیں تو چھت میں سے کچھ کھپرے گرے اور ان میں سے ایک میرے سر پر آن پڑا لیکن بہت زور سے نہیں اور ایک دوسرا کھپرا میرے الٹے مونڈھے پر اس بری طرح آ کر گرا کہ میرا پورا بازو سن ہو گیا۔"

گیووانی اپنی آنکھیں سکیڑ کر اور منہ پورا کھول کر ہنسنے لگا۔

"اس زمانے میں اور اس جگہ" اس نے اپنی ہنسی کے درمیان کہا" کھپروں، پتھروں اور لکڑیوں سب کی اپنی ایک خود مختار زندگی تھی اور بے جان چیزوں کے تشدد اور تندی کے طفیل ہمارے سروں پر خوب خوب گومڑے پڑے۔ کوئی سپاہی کہیں جاتا ہوا یا کھڑا ہوا ہوتا تھا اور ایک دم ایک لکڑی زمین سے اچھلتی اور اس کے آ لگتی تھی یا آسمان سے کوئی پتھر ٹپک پڑتا تھا۔ ظاہر ہے ان چیزوں پر ہمیں بہت طیش آتا تھا۔"

پستہ قد وینسینزو کی آنکھوں میں غمگینی کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس نے دھیرے سے کہا:

"ایسی چیزوں کا ذکر سننا ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے......"

"کیا کیا جائے۔ لوگ بہت آہستہ آہستہ سیکھتے ہیں۔ لیکن میں اپنی کہانی جاری رکھتا ہوں۔ میں نے لوگوں کو مدد کے لئے پکارا اور مجھے ایک گھر کے اندر لے جایا گیا۔ وہاں ہمارا ایک اور ساتھی بھی لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بری طرح ایک پتھر سے مجروح ہوا تھا اور جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیسے ہوا تو اس نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

''ایک بوڑھی عورت نے، دوست، ایک سفید بالوں والی چڑیل نے میرے پتھر مارا اور پھر مجھ سے کہنے لگی کہ اسے جان سے مار ڈالوں!،

''کیا اسے قید کر لیا گیا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''نہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میں نے گر کر چوٹ لگا لی ہے۔ ظاہر ہے کمانڈر نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ جس طرح اس نے میری طرف دیکھا اس سے ہی مجھے معلوم ہو گیا۔ لیکن میں یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ ایک بڑھیا نے مجھے زخمی کیا ہے؟ لعنت ہو اس قصے پر! ان لوگوں کی زندگی بڑی کٹھن ہے اور میں سمجھ سکتا ہوں کہ یہ ہم سے کیوں نفرت کرتے ہیں۔''

''اچھا تو یہ بات ہے، میں نے سوچا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک ڈاکٹر مع دو خواتین کے ہمارے پاس آیا۔ ایک عورت بہت ہی حسین تھی، اس کے بال سنہری تھے اور میرا خیال ہے کہ وہ وینس کی رہنے والی تھی۔ دوسری مجھے یاد نہیں رہی۔ انہوں نے میرے کندھے کا معائنہ کیا...... ظاہر ہے وہ معمولی سا زخم تھا...... اس پر تر کپڑا رکھا اور چلے گئے۔''

گیووانی کی تیوری پر بل پڑ گئے اور وہ خاموش ہو کر اپنے ہاتھ ملنے لگا۔ اس کے دوست نے جام کو ایک دفعہ پھر بھر دیا۔ شراب انڈیلتے وقت اس نے جگ بہت اونچا اٹھا رکھا تھا اور اس کی وجہ سے شراب کی سرخ لال رنگ کی دھار ہوا میں لرز رہی تھی۔

''میرا ساتھی اور میں کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے'' گیووانی افسردہ خاطری سے کہنے لگا۔ ''ہم دھوپ کی زد سے بچ کر سائے میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہم نے اس حسینہ کی رسیلی آواز سنی جو اپنی سہیلی کے اور ڈاکٹر کے ساتھ باغ میں گل گشت کر رہی تھی۔ وہ لوگ فرانسیسی میں بات چیت کر رہے تھے جو میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔

''تم نے اس کی آنکھیں دیکھیں؟، میں نے اس حسینہ کو کہتے سنا۔ وہ بھی ظاہر ہے کسان ہی ہے اور جب وہ اپنی فوجی وردی اتارے گا تو غالباً اوروں کی طرح وہ بھی سوشلسٹ ہی ہو جائے گا۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایسی آنکھوں والے لوگ تمام دنیا کو

تسخیر کرنے کے خواب دیکھتے ہیں، ہر چیز کو بدلنا چاہتے ہیں اور ہمیں نکال باہر کرنے اور تباہ و برباد کرنے کے خواہش مند ہیں! اور یہ سب کچھ اندھے، احمقانہ عدل و انصاف کے نام پر!،

''بے وقوف لڑکے، ڈاکٹر نے کہا، نیم بچہ، نیم جانور۔''

''جانور تو ہیں لیکن ان میں بچوں کی سی کیا بات ہے؟''

''اوہ، وہ عالم گیر مساوات کے خواب......

''ذرا خیال تو کرو، وہ چلائی۔ ''میں اس بیل جیسے دیدوں والے شخص کے برابر اور اس دوسرے چڑیا کے سے چہرے والے کے برابر اور ہم سب، تم اور یہ اور میں ان لوگوں کے، ان نیچ لوگوں کے برابر!...... ان لوگوں کے جنہیں خود اپنے ہی جیسے لوگوں کو، اپنی ہی طرح کے جانوروں کو، قتل کرنے کے لئے نوکر رکھا جا سکتا ہے......''

''وہ بہت دیر تک اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ بولتی رہی اور میں سنتا رہا اور دل ہی دل میں نے کہا: اوہ، سینیورا! میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا اور تم جانتے ہی ہو کہ ایک سپاہی کس شدت جذبات کے ساتھ عورت کے متعلق سوچ سکتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ میں اسے نرم دل اور مہربان سمجھا تھا، اور عقل مند بھی۔ کیونکہ ان دنوں میں یہ سمجھتا تھا کہ اونچے طبقوں کے سب لوگ بے انتہا عقل مند ہوتے ہیں۔

''میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ اس نے ان لوگوں کی گفتگو سمجھی یا نہیں۔ وہ فرانسیسی زبان بالکل نہیں جانتا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ سنہری بالوں والی حسینہ کیا کہہ رہی تھی تو اسے بہت طیش آ گیا، وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور پھر کمرے میں ٹہلنے لگا، اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ ٹھیک ہو گا کہ ایک آنکھ، کیونکہ دوسرے پر تو پٹی بندھی ہوئی تھی۔

''تو یہ بات ہے!، وہ گرجا۔ وہ مجھے استعمال کرتی ہے لیکن مجھے آدمی نہیں سمجھتی! اس کی خاطر میں سپاہیانہ زندگی کی ذلتیں سہوں اور وہ میری خودداری کو اس طرح کچلے! وہ مجھے انسانی وقار رکھنے کا حق دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہے! میں تو اس کی

جائداد کی حفاظت کے لئے اپنی روح کو کھونے کا خطرہ مول لوں......"

"وہ احمق آدمی نہیں تھا اور اسے اپنی بہت توہین محسوس ہو رہی تھی۔ اور مجھے بھی۔ اگلے دن ہم دونوں بالکل صاف صاف، کھلے طور پر اس خاتون کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ لواوٹو صرف آہستہ سے کچھ بڑبڑایا اور اس نے ہمیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا:

"میرے بچو، مت بھولو کہ تم سپاہی ہو اور ڈسپلن بھی کوئی چیز ہے!"

"ہم یہ بات بھولے نہیں تھے۔ لیکن اس دن سے ہم میں سے اکثر لوگ، اور سچ پوچھو تو تقریباً سبھی لوگ، گونگے اور بہرے ہو گئے اور بہرے ہو گئے اور وہ کسان بھی ہماری ان اچانک معذوریوں کا فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکے۔ جیت ان کی ہوئی۔ وہ ہم سے بہت دوستانہ طریقے سے پیش آنے لگے۔ وہ سنہری بالوں والی حسینہ ان سے بہت کچھ سیکھ سکتی تھی۔ مثلاً وہ اس کو سکھا سکتے تھے کہ ایماندار لوگوں سے کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ جب آخر کار ہمیں اس جگہ سے ہٹایا گیا جہاں ہم خوں ریزی کے ارادے سے آئے تھے تو ہم میں سے بہتوں کو پھولوں کے تحفے ملے۔ جب ہم گاؤں کی سڑکوں پر مارچ کر رہے تھے تو گاؤں والوں نے ہمارے اوپر پھول برسائے، میرے دوست پھول۔ کھپرے اور پتھر نہیں! اور میرا خیال ہے ہم ان پھولوں کے مستحق بھی تھے۔ اس شاندار رخصتی مظاہرے کے بعد ہم اپنے غیر دوستانہ قسم کے خیر مقدم کو بھول سکتے تھے!"

وہ ہنسا اور پھر بولا "اچھا تو وینیسیز واب اس کی نظم بناؤ......"

وینیسیز و نے کچھ سوچ بچار کے عالم میں مسکراتے ہوئے جواب دیا:

"ہاں یہ ہے تو نظم کے لئے موزوں مواد! میرا خیال ہے میں اسے شعر کا جامہ پہنا سکتا ہوں۔ جب آدمی عمر کی پچیس منزلوں سے گزر جائے تو عشقیہ نظمیں لکھنا اس کے لئے آسان نہیں رہتا۔"

اس نے وہ پھول جو اب مرجھا چکا تھا پھینک دیا، ایک اور پھول توڑ لیا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بعد نیچی آواز میں کہنے لگا:

''جب آدمی اپنی ماں کے سینے سے اپنی محبوبہ کے سینے تک کا راستہ طے کر چکے تو اسے ایک اور قسم کی مسرت کی جستجو کرنی چاہیے۔''

اس کا ساتھی اپنے جام کو ہلاتا رہا اور کچھ نہیں بولا۔ نیچے سمندر ہلکے ہلکے سرگوشیاں کر رہا تھا اور گرم ہوا پھولوں کی خوشبو سے عطر بار تھی۔

''یہ سورج ہے جو ہمیں اتنا زیادہ کاہل اور اتنا زیادہ نرم بنا دیتا ہے۔'' گیووانی نے زیر لب کہا۔

''میں اب اچھی عشقیہ نظمیں نہیں لکھ سکتا، میں اپنے آپ سے بہت غیر مطمئن ہوں۔'' وینیسنز نے اپنی پتلی پتلی بھویں چڑھا کر کہا۔

''تم نے کوئی نئی نظم کہی؟''

وینیسنزو نے فوراً جواب نہیں دیا۔

''ہاں'' آخر کار وہ بولا ''کل ہوٹل ''کومو'' کی چھت پر۔''

اور اس نے نیچی آواز میں خوش الحانی سے نظم پڑھنی شروع کی:

ساحل سنسان ہے اور خزاں کا سورج
پرانی خاکستری چٹانوں سے محبت کے ساتھ
رخصت ہو رہا ہے۔
بھوکی لہریں سیاہ پتھروں پر لپکتی ہیں،
اور سورج کو ٹھنڈے نیلے پانی میں غوطے
دیتی ہیں۔
اور خزاں کی ہوا کے ہاتھوں منتشر، تانبے کے
رنگ کے پتے
مردہ پرندوں کی لاشوں کی طرح
لہروں کے کف میں چمک
چمک اٹھتے ہیں۔

غم آگیں پیلا آسمان غضب ناک سمندر
کو دیکھ رہا ہے
اور صرف سورج، جو آرام کے لئے جا
رہا ہے، خندہ زن ہے۔

دونوں بہت دیر تک خاموش رہے، وینیسز و نے اپنا سر جھکا لیا اور زمین کو تکنے لگا۔ دوہرے ڈیل والا گیووانی مسکرایا۔

''ہر چیز کے متعلق خوبصورتی سے لکھا جا سکتا ہے لیکن انسان کے، اچھے انسانوں کے، متعلق گیت سب سے زیادہ اچھی طرح لکھے جا سکتے ہیں!''

میکسم گورکی

درندہ

ہم نے پیری کیپ کو طبیعت کے انتہائی چڑ چڑے پن اور بدترین صورت حال کے تحت یعنی جنگلی بھیڑیوں کی طرح گرسنہ اور تمام دنیا سے متنفر خیر باد کہا تھا۔ مکمل بارہ گھنٹے ہم نے اس کوشش میں صرف کر دیئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح...... جائز یا ناجائز طریقے، چوری کے ذریعے یا خود کما کر پیٹ پوجا کا سامان کریں، مگر جب ہمیں اس امر کا پورا یقین ہو گیا کہ ہم اپنے مقصد میں کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے، تو ہم نے آگے بڑھنے کا قصد کیا...... کدھر؟...... بس ذرا آگے:

یہ فیصلہ اتفاق آراء سے منظور ہو گیا۔ اب ہم زندگی کی اُس شاہراہ پر، جس پر ہم ایک مُدت سے گامزن تھے، سفر کرنے کو تیار تھے۔ اس امر کا فیصلہ بالکل خاموشی میں ہوا اگر اس فیصلے کو کوئی چیز نمایاں طور پر ظاہر کرنے والی تھی تو وہ ہماری گرسنہ آنکھوں کی خشمناک چمک تھی۔

ہماری جماعت تین افراد پر مشتمل تھی۔ جن کی شناسائی کو ابھی بہت مدت نہ گذری تھی۔ ہماری دوستی دریائے نیپر کے کنارے خرسون کی ایک سرائے میں واقع ہوئی تھی۔ ہم میں سے ایک ریلوے پولیس میں سپاہی رہا تھا اور اس کے بعد پولستان میں ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرتا رہا تھا یہ شخص بہت تنومند اور جسم تھا۔ بال سرخ...... جرمن زبان بول سکتا تھا اور قید خانوں کی اندرونی زندگی سے بہت اچھی طرح

واقف تھا۔

ہماری قسم کے لوگ اپنی زندگی کے گذشتہ حالات پر روشنی ڈالنے کے خیال کو بہت برا تصور کرتے ہیں، بعض ناگزیر وجوہ کے باعث ہمیشہ خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمیں اس کا کامل یقین تھا کہ ہمارے ہر ساتھی کے ساتھ ایک نہ ایک تلخ حکایت ضرور وابستہ ہے مگر ہم نے اُن سے اس داستان کے بارے میں کبھی استفسار نہ کیا تھا۔

جب ہمارے ایک ساتھی نے ہمیں یہ بتایا کہ وہ ماسکو یونیورسٹی کا طالب علم رہ چکا ہے۔ تو ہمیں اُس کی بات کا یقین ہوگیا۔ دراصل ہمارے لیے یہ چیز کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی کہ وہ گذشتہ ایام میں چور تھا یا سپاہی۔ قابلِ ذکر بات تو یہ تھی کہ وہ جب ہم سے ملا، بالکل ہم جیسا تھا اور ہماری طرح پولیس اور دیہات والوں میں مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور وہ جواب میں ان سب کو ایک تعاقب زدہ بھوکے درندے کی طرح افسردہ اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا قصہ کوتاہ ان خیالات اور موجودہ حالات کی رُو سے وہ ہم میں سے ایک تھا۔

مشترکہ مصائب، متضاد طبائع میں اتحاد پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں اور ہمیں اس کا پورا یقین تھا کہ ہم مصیبت زدہ ہیں۔ تیسرا میں تھا...... اپنے شرمیلے پن کی وجہ سے جو بچپن سے میری خصوصیت رہی ہے، میں اپنی صفات کا تذکرہ بے سُود سمجھتا ہوں۔ میری عادات و خصائل پر روشنی ڈالنے کے لیے بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ میں اپنے آپ کو اوروں سے ہمیشہ اچھا اور اعلیٰ سمجھتا رہا ہوں...... اور آج بھی میرا یہی عقیدہ ہے۔

ان حالات کے تحت ہم پیری کوپ کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ رہے تھے

ہمارا اولیں مقصد کسی گڈریے کا دروازہ کھٹکھٹا کر روٹی مانگنا تھا۔ یہ لوگ عموماً کسی جہاں گرد سائل کو مایوس لوٹنے نہیں دیتے۔

میں اور سپاہی پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ طالب علم ہمارے پیچھے آرہا تھا جس کے کاندھوں پر کوئی کپڑا سا لٹک رہا تھا، جس نے کبھی جیکٹ کا کام دیا ہوگا۔ ایک بوسیدہ اور چوڑے کنارے والی ٹوپی اس کے بدوضع سر کی زینت ہو رہی تھی، پتلی ٹانگوں کو ایک

پرانی پیوند زدہ پتلون چھپا رہی تھی اور پاؤں میں کسی ٹوٹے ہوئے بُوٹ کے تلوے جو اُس نے غالباً کسی سڑک پر سے اُٹھائے تھے۔ ایک رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ اس افزاع کو وہ چپلوں کے نام سے پکارتا تھا۔ وہ سڑک پر گرد اُڑاتا اور اپنی چھوٹی سبزی مائل آنکھیں جھپکاتا' خاموشی کے ساتھ چلا آرہا تھا۔

سپاہی ایک سُرخ قمیص پہنے ہوئے تھا۔ جو بقول اُس کے اُس نے خود اپنی محنت کے پیسوں سے فرسون میں خریدی تھی۔ اس قمیص پر ایک گرم اور نرم سی واسکٹ نظر آرہی تھی۔ ٹانگوں پر ایک کھلا پاجامہ لپٹا ہوا تھا سر پر اُس نے ایک فوجی ٹوپی ترچھے انداز میں پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بوٹ وغیرہ کچھ بھی نہیں تھے۔

میں نے کپڑے تو پہنے ہوئے تھے مگر ننگے پاؤں تھا۔

ہم چلتے رہے...... ہمارے چاروں طرف میدان تھا جس میں گھاس اُگ رہی تھی، ہم موسم گرما کے نیلگوں آسمان کے نیچے بڑھتے گئے...... کہیں کہیں کٹی ہوئی فصل کے نشانات بھی دکھائی دے رہے تھے، جو بعینہٖ سپاہی کے نہ منڈے ہوئے گالوں کے مانند تھے۔

وہ بھدی اور کن سڑی آواز میں ایک مذہبی گیت گانے میں مصروف تھا دوران ملازمت میں وہ کسی گرجے میں نوکر بھی رہ چکا تھا۔ اس لیے لازمی طور پر اُسے بے شمار مذہبی گیت زبانی یاد تھے۔ اور ہم سے دوران گفتگو میں اکثر اس قسم کی معلومات کا بے جا تذکرہ بھی کیا کرتا تھا۔

اب ہمارے سامنے افق پر دھندلی سی لکیریں نمودار ہو رہی تھیں جن کا رنگ بنفشی سے ہلکا زرد ہوتا چلا جا رہا تھا۔

"یہ کریمیا کی پہاڑیاں ہیں" طالب علم نے اپنی پھٹی آواز میں کہا "پہاڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔"

سپاہی نے طنزیہ لہجے میں اُس سے کہا "بہت تیز نظر ہے تمہاری یہ تو بادل ہیں، محض بادل! اور بادل بھی کیسے، جیسے اناس کا مُربّہ دودھ میں بھیگ رہا ہے!"

''آہ، کاش یہ واقعی مربہ ہوتے!!'' اس تشبیہ نے میری بھوک پر تازیانے کا کام کیا۔''

''خدا کی قسم!'' سپاہی نے جھلا کر کہا'' کاش ہمیں کوئی انسان مل جائے! ......مگر یہاں تو کسی کا نام ونشان تک بھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں بھی موسم سرما کے ریچھ کی طرح اپنے پنجے چوس کر گذارہ کرنا ہوگا!''

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ہمیں آبادی کا رُخ کرنا چاہیے'' طالب علم نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''تم نے کہا تھا!...... یہ تمہارا ہی حصہ تھا، تعلیم یافتہ جو ٹھہرے تم!......مگر کہاں ہیں وہ آباد مقامات جن کا تم ذکر کر رہے ہو'' سپاہی طالب علم پر برس پڑا۔

طالب علم نے جواب میں اپنے ہونٹ چبانے شروع کر دیئے۔ اور خاموش ہوگیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ بادل رنگا رنگ کے لباس بدل رہے تھے۔ شورے اور مٹی کی خوشبو نے ہماری بھوک کو اور بھی مشتعل کر دیا۔ انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اور ایک ناخوشگوار سی لہر بدن میں دوڑ رہی تھی۔ منہ اور حلق خشک ہوگیا تھا دماغ سخت پریشانی میں گرفتار تھا سر چکرانے لگا۔ اور عجیب قسم کے سیاہ دھبے آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ یہ دھبے کبھی گوشت کے بھنے ہوئے ٹکڑوں کی اور کبھی روٹیوں کی شکل اختیار کر لیتے......ذہن نے ان کی یاد تازہ کر دیا اور یہ اصل معلوم ہونے لگے۔ حتیٰ کہ ان کی خوشبو تک بھی آنے لگی۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی پیٹ میں نوکیلا خنجر گھونپ رہا ہے۔ لیکن اب اس اذیت کے باوصف ہم بھیڑوں کے نشانات دیکھنے اور کسی پھلوں سے لدے ہوئے چھکڑے کے پہیوں کی آواز سُننے کے لیے ادھر اُدھر نگاہ دوڑاتے اور کان کھولے چلتے رہے......مگر میدان خاموش اور سنسان تھا۔

اس پر تکان سفر سے پیشتر شام کو ہم سب نے صرف دو سیر پکی روٹی اور پانچ تربوز کھائے تھے، ہمیں کوئی چالیس میل کے قریب چلنا پڑا تھا۔ خرچ آمدن کی نسبت

زیادہ تھا ہم مارکیٹ میں سو رہے تھے۔ کہ ہمیں بھوک نے آجگایا۔

طالب علم نے ہم سے کہا تھا کہ رات کو سونے کے بجائے کام کرنا چاہیے اور رہی دوسری بات کہ کسی کی ملکیت پر ڈاکہ ڈالنا، سو وہ معاشرہ کے اصولوں کے خلاف ہے، اس لیے میں اُس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میری خواہش انصاف کرنے کی ہے۔ میں یاوہ گوئی نہیں کر سکتا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ ہمارے اس مہذب زمانے میں لوگ بہت شائستہ اور نرم دل ہوتے جارہے ہیں حتیٰ کہ اگر کسی پڑوسی کا گلا بھی کاٹنا ہو تو موقع کی مصلحت دیکھ کر یہ کام بھی نہایت سلیقے سے کیا جاتا ہے۔ میرے اپنے گلے کے تجربے نے اخلاق اور تہذیب کے اس ارتقا کو میرے سامنے واضح طور پر ظاہر کر دیا ہے۔ اور میں قطعی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کی ہر شے رو بہ ترقی ہے......شراب خانوں عصمت فروشی کی دوکانوں اور زندانوں کی تعداد میں سالانہ اضافے اس ترقی کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔

چنانچہ اس طرح ہم اپنا لعابِ دہن نگلتے اور آپس میں دوستانہ گفتگو کرتے ہوئے، تاکہ کسی حیلے ہمارے پیٹ کا درد کم ہو جائے اس سنسان میدان میں بڑھتے گئے۔ دل میں ایک موہوم اُمید لیے ہوئے سُرخ شفق کی طرف چلتے گئے!

ہمارے سامنے سورج اُن بادلوں کے پیچھے جن پر اُس کی شعاعیں زرنگاری کا کام کر رہی تھیں، غروب ہو رہا تھا۔ اب ہمارے سامنے چاروں طرف رات کی سیاہی افق کی وسعت کو تنگ کرتی ہوئی پھیل رہی تھی۔

آگ جلانے کے لیے کچھ ایندھن تو اکٹھا کرو" سپاہی نے دفعتہً زمین پر سے لکڑی کا ایک ٹکڑا اُٹھاتے ہوئے کہا" ہمیں آج کی رات میدان ہی میں کاٹنا پڑے گی......اوس خوب پڑے گی، خشک گوبر اور درختوں کی ٹہنیاں الاؤ کے لیے ٹھیک رہیں گی؟"

ہم سڑک کے دونوں طرف بکھر گئے اور سوکھی گھاس اور ہر وہ چیز جو جل سکتی تھی اکٹھا کرنی شروع کر دی۔ ہر مرتبہ جب ہمیں زمین پر جھکنا پڑتا۔ ہمارے بدن میں ایک

عجیب خواہش پیدا ہوتی کہ زمین پر گر پڑیں اور مٹی کھانے کے لیے خاموش لیٹ جائیں......سیاہ اور چکنی مٹی کھاتے رہیں۔ حتیٰ کہ اور کچھ نہ کھا سکیں اور پھر اسی حالت میں سو جائیں خواہ یہ نیند ابدی نیند ہی کیوں نہ ہو لیکن اس سے بیشتر کچھ کھائیں ضرور...... کوئی سی غذاء کوئی گرم گرم کھانا حلق سے اُتر کر تلملاتے ہوئے اور بھوکے پیٹ میں پہنچ جائے......اُس معدے میں جو کسی چیز کو ہضم کرنے کی خواہش میں بیتاب ہوا جا رہا تھا۔

''کاش ہمیں کوئی جڑ ہی مل جاتی'' سپاہی نے آہ بھر کر کہا ''ایسی جڑیں بھی تو ہوتی ہیں جو غذا کا کام دے سکتی ہیں......جن کو ہم کھا سکتے ہیں!''

مگر اس سیاہ اور ہل کی ہوئی زمین میں جڑوں کا نام و نشان تک نہ تھا......اب جنوبی ممالک کی رات تیزی سے شفق پر غلبہ حاصل کر رہی تھی، سورج کی آخری شعاعیں ابھی غائب ہی ہوئی تھیں کہ تاریک اور نیلگوں آسمان میں تارے چمکنے لگے۔ آہستہ آہستہ رات کی سیاہی میدان کی وُسعت کو تنگ بناتی ہوئی بڑھتی گئی۔

بھائی، ہمارے بائیں طرف ایک آدمی لیٹا ہوا ہے!'' طالب علم نے سپاہی سے آہستگی کے لہجے میں کہا۔

آدمی!'' سپاہی نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ''آخر وہ یہاں کیوں لیٹ رہا ہے؟

''جاؤ، اُس سے خود دریافت کر لو......اُس کے پاس کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا جبھی تو اس طرح میدان میں پڑا ہے۔'' طالب علم نے جواب دیا۔

سپاہی تھوکنے کے بعد ایک عزم سے بولا ''تو چلو آؤ اُس کے پاس چلیں''

صرف طالب علم کی تیز نگاہیں ہی تاریکی میں سڑک کی دوسری طرف کوئی سو گز کے فاصلے پر ایک آدمی کو جو سیاہ ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا پہچان سکتی تھیں۔ ہم ہل کی ہوئی زمین میں مٹی کے ڈھیلوں پر تیزی سے قدم اُٹھائے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ کھانا حاصل کرنے کی اس نئی اُمید نے ہماری بھوک کو اور بھی زیادہ تیز کر دیا تھا ہم اُس کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ مگر وہ بے حرکت پڑا رہا۔

''شاید یہ انسان نہیں ہے'' سپاہی نے ہم سب کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے مایوسانہ انداز میں کہا۔ مگر فوراً ہمارے اندیشے غلط ثابت ہو گئے کیونکہ اُس ڈھیر میں جو زمین پر پڑا تھا ایک جنبش ہوئی اور اُس نے اُٹھنا چاہا۔ اب ہم نے دیکھا کہ وہ واقعی انسان ہے۔ جو گھٹنوں کے بل بیٹھا ہے اور ہماری طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے۔

''میرے نزدیک نہ آنا ورنہ میں گولی چلا دُوں گا'' ہم نے اُسے بھدی اور لرزاں آواز میں یہ کہتے سُنا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں لبلبی اُٹھنے کی تیز آواز گونجی۔

ہم یکا یک ٹھہر گئے جیسے کسی نے حکم دیا ہے۔ کچھ عرصے تک ہم اُس ناخوشگوار خیر مقدم سے حیرت زدہ ہو کر خاموش کھڑے رہے۔

''بدمعاش!'' سپاہی نے معنی خیز انداز میں زیرِ لب کہا۔

''ہوں، پستول لیے پھرتا ہے۔ یہ تو منہ کا نوالا معلوم نہیں ہوتا'' طالب علم نے دانشمندانہ لہجے میں کہا۔

''او میاں!''...... ظاہر تھا کہ ہمارے رفیق سپاہی نے ضرور کوئی تدبیر سوچ لی ہے۔

اُس شخص نے کروٹ نہ بدلی اور پہلے کی طرح خاموش رہا۔

''اے میاں' دیکھو ہم تم کو بالکل نقصان نہ پہنچائیں گے۔ بس ہمیں کچھ کھانے کے لیے دے دو۔ تمہارے پاس روٹی وغیرہ ضرور ہو گی، بھائی ہمیں کچھ کھانے کے لیے دے دو۔ تمہیں مسیح کا واسطہ ہے...... لعنت ہو تم پر...... شیطان!'' آخری الفاظ سپاہی نے اپنی ڈاڑھی کے اندر منہ ڈال کر آہستگی سے کہے...... وہ شخص خاموش رہا۔

''کیا سُن بھی رہے ہو کہ نہیں؟'' سپاہی نے بیچارگی اور غصہ میں کانپتے ہوئے پھر التجا کی'' ہمیں کچھ دو...... پھینک ہی دو، ہم تمہارے نزدیک نہ آئیں گے!''

''اچھا'' اُس شخص نے بالآخر جواب دیا۔

اگر اُس نے ہمیں دلی خلوص سے ''میرے عزیز بھائیو'' کہہ کر پکارا ہوتا۔ اور تین لفظوں میں جذبات کا تمام تقدس بھر دیا ہوتا۔ تو وہ ہم پر اُس قدر اثر انداز نہ ہوتے

جتنا یہ غیر مہذبانہ، درشت اور خشک ''اچھا'' اثر انداز ہوا۔

''نیک آدمی' ہم سے خوف زدہ مت ہو' سپاہی نے اپنے چہرے کو متبسم کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ شخص تاریکی میں پچاس قدم کے فاصلے پر بیٹھا ہوا اُس کے اس تبسم کو نہ دیکھ سکتا تھا۔'' ہم امن پسند لوگ ہیں۔ رُوس سے کیوبن جارہے ہیں۔ ہمارا سب روپیہ راستے میں خرچ ہو گیا ہے۔ ہم سب کھاپی بیٹھے ہیں۔ اب ہمیں فاقے سے دوسرا دن گذر رہا ہے!''

''لو پکڑو'' ہمارے محسن نے ہوا میں اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ایک سیاہ سی چیز بل کی ہوئی زمین پر ہمارے نزدیک ہی آگری طالب علم اس کو پکڑنے کے لیے لپکا۔

لو اور پکڑو...... یہ رہی...... بس اب میرے پاس ختم ہو چکی ہے۔''

جب طالب علم نے اُن عجیب وغریب تحائف کو اکٹھا کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سیاہ روٹی کے چند خشک ٹکڑے تھے۔ جن کا مجموعی وزن کوئی دو سیر کے قریب ہوگا مٹی سے لت پت ہو رہے تھے۔ مگر یہ بات ہمارے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی...... خشک روٹی عموماً زیادہ تسکین دہ ہوا کرتی ہے۔ اس لیے اس میں تازہ روٹی کی نسبت نمی کم ہوتی ہے۔

''یہ لو تم اور یہ لو تم اور یہ میرے لیے'' سپاہی نے بڑی احتیاط سے سب کو روٹی کا حصہ دیتے ہوئے کہا''...... مگر ابھی حصے برابر نہیں ہوئے۔ اس لیے ''پروفیسر صاحب'' مجھے آپ کے ٹکڑے سے کچھ حصہ کاٹنا پڑے گا ورنہ یہ دوسرے حق میں سر سر نا انصافی ہوگی!''

طالب علم کو مجبوراً اپنے حصے سے ایک ٹکرا دینا پڑا، جو وزن میں ایک اونس کے دسویں حصے کے برابر تھا۔

میں نے اپنا ٹکڑا منہ میں ڈال لیا۔ اور اُسے آہستہ آہستہ چبانا شروع کیا ساتھ ہی میں اپنے جبڑوں کی قدرتی حرکت روکنے کی بے سود سعی کر رہا تھا جو اس وقت

پتھروں کو چبانے کے لیے تیار تھے۔ مجھے اپنے نرخرے میں ایک تشنجی حرکت کے احساس اور ایسے چھوٹے چھوٹے لقموں سے آہستہ آہستہ رفع کرنے کی کوشش میں ایک عجیب قسم کی مسرت حاصل ہو رہی تھی۔ گرم اور نا قابل بیان طور پر ذائقہ دار اور شیریں اس روٹی کے ٹکڑے لقمہ بہ لقمہ حلق سے اُتر کر جلتے ہوئے پیٹ میں پہونچتے ہی خون اور گوشت میں تبدیل ہوتے معلوم ہوتے تھے۔

میرا دل ایک ایسی نا قابل بیان اور حیات بخش مسرت سے معمور تھا جو اُس روٹی کی نسبت کے لحاظ سے کہیں زیادہ تھی۔ جو میرے پیٹ کے اندر پہنچ رہی تھی میرے تمام جسم پر ایک خمار کی سی حالت طاری تھی۔ میں فاقہ کشی کے تکلیف دہ ایام کو بالکل بھول گیا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن سے اپنے دوستوں کی یاد بھی محو ہوگئی اس لیے کہ میں اُن مسرت افزا خیالات میں غرق تھا جو اس وقت میرے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔

لیکن جب میں نے اپنی ہتھیلی سے روٹی کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالا تو میں نے محسوس کیا کہ میری بھوک اور بھی تیز ہوگئی ہے۔

''اس آدمی کے پاس کچھ اور بھی ضرور ہوگا......لعنت ہو اس پر!'' سپاہی نے جو زمین پر بیٹھا اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ کہا

''ضرور ہوگا...... روٹی میں سے گوشت کی بو آ رہی تھی' طالب علم نے جواب دیا اور پھر ساتھ ہی دلی زبان میں کہا'' کاش اُس کے پاس پستول نہ ہوتی ورنہ......''

''مگر یہ ہے کون؟''

''ظاہر ہے کہ ہم ایسا ہی کوئی بھلا مانس ہوگا''

''ناپاک کتا!'' سپاہی نے فیصلہ کر دیا۔

ہم سب ایک دوسرے کے بالکل قریب بیٹھے اپنے محسن کی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، جو پستول ہاتھ میں لیے خاموش بیٹھا تھا۔ اُس کی طرف سے کسی قسم کی آواز ہمیں سنائی نہ دے رہی تھی۔

رت کی تاریک قوتیں رہی سہی روشنی پر غالب آ گئیں۔ میدان پر قبر کی خاموشی

طاری تھی۔ اس سکوت میں ہم ایک دوسرے کے سانس کی آواز بخوبی سُن سکتے تھے کبھی کبھی بجو کی درد میں ڈوبی ہوئی چیخ سنائی دیتی تھی، ستارے آسمان کے چمن کے زندہ پھول، ہمارے سروں کے اوپر چمک رہے تھے...... ہماری اس وقت صرف ایک خواہش تھی کہ کچھ کھائیں!

میں فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس شب میری حالت میرے اتفاقیہ رفیقوں سے نہ تو بُری تھی اور نہ اچھی۔ آخر کار میں نے یہ تجویز پیش کی ہمیں اُٹھ کر اُس شخص کے پاس جانا چاہیے مگر بغیر کسی نقصان پہنچائے اُس سے کھانے کا سامان لے لینا چاہیے۔ اگر وہ فائر کرتا ہے تو کر لے! وہ زیادہ سے زیادہ ہم میں سے صرف ایک کو نشانہ بنا لے گا جو چنداں ممکن نہیں اگر بفرض محال اس کی گولی کسی ایک کو لگ بھی گئی تو عموماً پستول کا چھرہ مہلک زخم نہیں کرتا۔

''تو چلو پھر'' سپاہی نے کود کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ طالب علم کوشش کے باوجود بڑی آہستگی سے اُٹھا ہم دوڑ کر اس شخص کی جانب بڑھے۔ طالب علم ہمارے پیچھے آرہا تھا۔

''محترم رفیق'' سپاہی نے طنزاً چلا کے پکارا۔

ہمارا استقبال ایک زیر لب گنگناہٹ سے ہوا۔ پھر ساتھ ہی...... لبلبی دبنے کی آواز گونجی اور شعلہ بلند ہوا، اور گولی ہمارے کانوں کے قریب سے سنسناتی ہوئی گذر گئی۔

''نشانہ خطا گیا'' سپاہی فرطِ مسرت سے چلا اُٹھا اور ایک ہی جست میں اُسے جالیا۔ ''ٹھیر، بے شیطان، اب چکھائے دیتا ہوں تجھے مزا......

طالب علم اُس کے تھیلے کی طرف لپکا مگر وہ شیطان ایک دم پیٹھ کے بل زمین پر لوٹ گیا اور ہاتھ پھیلا کر ہانپنا شروع کر دیا۔

''ابے کیا ہوگیا تجھے؟ سپاہی نے حیران ہوتے ہوئے کہا'' او...... اے...... کچھ سُن رہا ہے کہ نہیں؟...... کیا تو نے اپنے آپ کو گولی تو نہیں مار لی؟''

''یہ رہا گوشت، ٹکیاں اور روٹی...... کافی مقدار ہے بھائیو'' طالب علم نے خوش ہو کر بلند آواز میں کہا۔

''تو جاؤ مرؤ جہنم میں جاؤ' آؤ دوستو' ہم کھانا کھائیں'' سپاہی چلایا۔

میں نے اُس شخص کے ہاتھ سے پستول لے لی۔ اب اُس نے کراہنا بند کر دیا تھا۔ اور خاموش پڑا تھا۔ پستول میں صرف ایک کارتوس اور باقی تھا۔

ہم اب پھر خاموشی سے کھانے میں مصروف تھے۔ اور وہ شخص بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس وقت ہم اُس کی موجودگی سے بالکل غافل تھے۔

''بھائیو، کیا تم نے یہ سب کچھ واقعی اس روٹی کے لیے کیا ہے؟'' ایک لرزاں اور پھٹی ہوئی بھدی آواز نے یک لخت ہم سے کہا۔ ہم چونک پڑے۔ طالب علم کھانستا ہوا زمین کی طرف جھک گیا۔ سپاہی نے اپنے منہ کا لقمہ نگلتے ہوئے اس شخص کو بیطرح سُنائی شروع کر دیں۔

او کتے کی روح...... خدا کرے تیرا بدن خشک لکڑی کے چھلکے کی طرح پھوٹ پھوٹ پڑے۔ کیا تو یہ خیال کرتا تھا کہ ہم تیری کھال ادھیڑنا چاہتے ہیں؟ تیری چمڑی ہمارے کس کام کی...... ملعون ، پاجی، کمینے!...... پستول لیے لوگوں پر گولیاں چلاتا ہے...... شیطان کہیں کا!''

سپاہی اس دوران میں ساتھ ساتھ کھاتا بھی جا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اُس کی گالیوں کا پورا زور شور بہت حد تک دب گیا تھا۔

''ٹھیر جا، ہم کھانا کھانے کے بعد تجھ سے نپٹ لیں گے!'' طالب علم نے اُسے دھمکایا۔

اس پر سسکیوں اور آہ وزاری کی آواز رات کے سکوت میں پھیل گئی...... ہم ڈر گئے۔

''بھائیو، مجھے معلوم نہ تھا۔ میں ڈر گیا تھا۔ چنانچہ میں نے فائر کر دیا۔ میں نیوا ایتھوس سے سائسک جا رہا ہوں...... آہ میرے خدا! جونہی آفتاب غروب ہونے لگتا

ہے، مجھے بخار چڑھ جاتا ہے...... میری تیرہ بختی! اس بخار کے علاج کرانے کی خاطر ہی میں نے ایتھوس کو خیر باد کہا تھا...... میں وہاں بڑھئی کا کام کیا کرتا تھا...... میں بڑھئی ہوں...... میری ایک بیوی اور دو چھوٹی بچیاں ہیں۔ جن سے جدا ہوئے مجھے قریب قریب چار سال گزر چکے ہیں...... بھائیو، تم سب کچھ کھالو......"

"کوئی فکر نہ کرو، ہم تیرے کہنے کے بغیر ہی سب کچھ کھالیں گے" طالب علم نے اُس سے کہا۔

"آہ، میرے پروردگار! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم لوگ امن پسند اور رحم دل ہو تو میں کبھی گولی نہ چلاتا...... جو کچھ ہوا اُس کا ذمہ دار یہ دشت نما میدان ہے اور پھر تاریکی میں سوجھ کیا سکتا ہے...... مجھے معاف کرو، بھائیو، میری خطا معاف کردو!" وہ بول رہا تھا اور ساتھ رو بھی رہا تھا۔ اُس کی رونی آواز لرزاں اور دہشت آفریں تھی۔

"بس بس اب چلاؤ نہیں" سپاہی نے حقارت سے کہا

"اس کے پاس کچھ نقدی بھی ضرور ہوگی!" طالب نے قیافہ لگایا۔

سپاہی نے اپنی آنکھیں نیم بند کرلیں۔ طالب علم کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم تو نجومی ہو...... چلو، اب آگ جلا کر سورہیں!"

اور اس کو یہیں پڑا رہنے دیں' طالب علم نے سپاہی سے دریافت کیا

"جہنم میں جائے یہ...... کیا ہم اسے بھون کھائیں؟"

"ہے تو اسی کا مستحق! طالب علم نے اپنا نوکیلا سر ہلایا۔

ہم اپنا اکٹھا کیا ہوا ایندھن، جو بڑھئی کی دھمکی سے ہمارے ہاتھوں سے گر پڑا تھا۔ اُٹھانے کے لیے روانہ ہوئے۔ منتشر کڑیوں کو جمع کرنے کے فوراً بعد ہم آگ جلا کر اُس کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے، آگ خاموش اور پرسکون رات میں ہمارے آس پاس کی کچھ جگہ کو روشن کرتی ہوئی آہستہ آہستہ سُلگ رہی تھی۔ ہم پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ مگر اس کے باوجود ہم ایک دفع اور کچھ کھانے کے لیے تیار تھے۔

"بھائیو" بڑھئی نے کہا وہ ہم سے کوئی تین قدم کے فاصلے پر لیٹا تھا کبھی کبھی

اُس گنگناہٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔

''کیوں، کیا ہے؟'' سپاہی نے درشت لہجے میں اُس سے دریافت کیا۔

''کیا میں آپ کے پاس آگ تاپنے کے لیے آسکتا ہوں؟...... مجھے اپنی موت آنکھوں کے سامنے نظر آرہی ہے...... میرے جوڑ جوڑ میں شدت کا درد ہے...... آہ، خدا! میں کبھی گھر نہ پہنچ سکوں گا!''

''ادھر سرک آؤ'' طالب علم نے اُسے اجازت دے دی۔

بڑھئی آہستہ آہستہ رینگتا ہوا آگ کے پاس آگیا۔ وہ اس انداز سے اپنے بدن کو حرکت دے رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اُسے اپنے اعضا کے ٹوٹنے کا خدشہ ہے وہ دراز قد مگر بہت نحیف تھا۔ اس کا ہر عضو ارتعاش پذیر تھا۔ اور اُس کی دھندلی آنکھوں سے درد و کرب کے آثار مترشح تھے جو اسے اندر ہی اندر ہلکان کر رہا تھا اُس کا افلاس زدہ چہرہ ہمارے الاؤ کی روشنی میں لاش کی طرح زرد۔ مٹیالا اور ہیبت ناک نظر آتا تھا۔ اُس کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ یہ ارتعاش ہمارے دل میں نفرت آمیز ہمدردی کے جذبات پیدا کر رہا تھا۔ استخوانی ہاتھوں کو آگ کی جانب بڑھا کر اُن کو آپس میں رگڑتے وقت اُس کی اُنگلیوں کے جوڑ چیخ رہے تھے۔ قصہ مختصر اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا جا سکتا تھا۔

''تم نے ایسی حالت میں پیدل چلنا کیوں اختیار کیا...... ہائے، کنجوسی!'' سپاہی نے اُس سے دریافت کیا۔

''انہوں نے مجھے منع کیا تھا...... کہ سمندر کے راستے نہ جاؤ، صلاح دی تھی کہ خشکی کے راستے کریمیا ہوتا ہوا جاؤں...... مگر بھائیو، میں اپنا سفر اب جاری نہیں رکھ سکتا...... میں مر رہا ہوں...... میں اس میدان میں تن تنہا مر جاؤں گا...... پرندے میری نعش کو نوچ لیں گے...... کسی کو خبر تک نہ ہوگی...... میری بیوی اور میری لڑکیاں میری منتظر ہوں گی...... میں اُنہیں خط لکھ چکا ہوں...... اس میدان میں بارش میری ہڈیاں بہا کر لے جائے گی...... آہ میرے پرودگار!...... میرے پروردگار!!''

اُس کی آواز کسی زخمی بھیڑیئے کی دردناک چیخ پکار کے مانند تھی۔

''آہ شیطان'' سپاہی نے جست کر کے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ بک بک کس لیے لگا رکھی ہے تم نے۔ کیا تم ہمیں ایک لمحہ چین بھی لینے دو گے یا نہیں......مرنا چاہتے ہو تو مر جاؤ مگر خدا کے لیے ذرا خاموش رہو......تمہاری ضرورت بھی کس کو ہے؟......اب خاموش ہی رہنا''

''سر پر ایک ڈھول نہیں جما دیتے!'' طالب علم نے سپاہی کو صلاح دیتے ہوئے کہا۔

''چلو اب سو جائیں'' میں نے کہا ''اور رہے تم، اگر آگ تاپنا چاہتے ہو تو خدا کے لیے زبان منہ میں ہی رکھنا''

سُن رہے ہو؟'' سپاہی نے بڑھئی سے غصے میں دریافت کیا'' یہ خیال دماغ سے نکال دو کہ ہم تم پر ترس کھا کر تمہاری تیمارداری کریں گے۔ اس لئے کہ تم نے ہمیں روٹی کا ٹکڑا دیا تھا اور ہم پر فائر کیا تھا۔ تم مکمل شیطان ہو...... یہ کام کوئی اور ہی کرے گا۔''

سپاہی نے اور کچھ نہ کہا اور اپنے آپ کو زمین پر دراز کر دیا۔ طالب علم پہلے ہی سے لیٹا ہوا تھا۔ میں بھی لیٹ گیا، خوفزدہ بڑھئی جسم کو سکیڑتے ہوئے الاؤ کی طرف بڑھا اور آگ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ میں اُس کے داہنے پہلو میں لیٹا اُس کے دانتوں کی رگڑ کی آواز کو سُن رہا تھا۔ طالب علم اُس کے بائیں طرف سکڑا ہوا تھا اور غالباً لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ سپاہی اپنے سر کو ہاتھوں کا سہارا دیئے آسمان کو تک رہا تھا۔

''کیسی سہانی رات ہے، کسقدر ستارے چمک رہے ہیں'' تھوڑے عرصے کے بعد وہ مجھ ''سے مخاطب ہو کر کہنے لگا'' دیکھو ایک لحاف کی طرح معلوم ہوتا ہے...... جہاں نوردی کی اس زندگی کو میں واقعی پسند کرتا ہوں...... گویا ایسی زندگی میں سردی کی شدت اور فاقہ کشی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ مگر آزادی تو ہے......تمہارا کوئی آقا نہیں اپنے کاروکردار کے تم خود مالک ہو...... اگر اپنا سر بھی چاٹنا چاہو تو تمہیں کوئی روکنے والا نہیں...... یہ زندگی خوشگوار ہے!...... ایامِ فاقہ کشی نے میری طبیعت کو بگاڑ دیا تھا......مگر

اب میں یہاں پر لیٹا آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ ستارے جھلملا رہے ہیں۔ جیسا کہ وہ مجھ سے کہنا چاہتے ہیں، 'لیکو تن' کچھ پروانہ کرو، جاؤ، سیاحت کرتے رہو مگر خیال رہے کسی کی غلامی قبول نہ کرنا...... دل کسقدر مسرور ہے!...... میاں بڑھئی کہو تمہارا کیا حال ہے؟ ...... بھئی خفامت ہونا ہم سے۔ اگر ہم نے تمہاری روٹی کھالی ہے تو کیا مضائقہ ہے؟ تمہارے پاس کچھ کھانے کو تھا اور ہم بھوکے تھے، چنانچہ ہم نے اُسے کھالیا...... مگر تُم بہت خطرناک آدمی ہو۔ تم نے ہم پر گولی چلائی تھی...... تمہاری اس حرکت نے مجھے سخت برانگیختہ کر دیا تھا۔ اور اگر تم خود بخود زمین پر نہ گر پڑتے تو میں تمہیں اس گستاخی کا مزا چکھا دیتا...... روٹی کا افسوس نہ کرو۔ پیری کوپ پہونچ کر تم کھانا خرید سکتے ہو...... مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس نقدی ضرور موجود ہے...... کب سے بخار آرہا ہے تمہیں؟"

ایک عرصے تک سپاہی کی بھدی اور کرخت آواز اور بڑھئی کی لرزاں گنگناہٹ میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ رات...... جواب کاجل کی طرح سیاہ تھی، زمین پر اپنی پوری تاریکیوں کے ساتھ نیچے اُتر رہی تھی۔ میرے سینے کو فضا کی بھینی بھینی خوشبو فرحت بخش رہی تھی، آگ کی ہلکی روشنی اور اس کی گرمی جان بخش تھی...... میری آنکھیں بند ہوگئیں۔

"اٹھو، جلدی کرو...... چلو چلیں!"

میں گھبرا کر اُٹھا اور سپاہی کی مدد سے جو مجھے آستین پکڑ کر زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

چلو اب تیزی سے قدم بڑھاؤ!"

اُس کے چہرے سے گھبراہٹ ہویدا تھی۔ میں نے اپنے گردو پیش نگاہ دوڑائی۔ سُورج طلوع ہو رہا تھا اور اس کی ایک گلابی کرن بڑھئی کے ساکت اور مردہ چہرے پر پڑ رہی تھی...... اُس کا مُنہ کھلا تھا، اُس کی آنکھیں جو باہر کو ابھری ہوئی تھیں ایک بے نور اور دہشت زدہ صورت میں آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں اُس کا کرتہ چھاتی

کے مقام سے پھٹا ہُوا تھا۔ اور وہ ایک غیر فطری انداز میں زمین پر اینٹھا پڑا تھا۔

بہت دیکھ چکے، چلو اب میں جو کہتا ہوں اب چلو!" سپاہی نے میرا بازو کھینچ کر چلنے کو کہا۔

"کیا یہ مر چکا ہے؟" میں نے صبح کی ناخوشگوار تازگی اور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے اُس سے پُوچھا۔

"ہاں' مر چکا ہے، اگر تمہارا گلا گھونٹ دیا جاتا تو یقیناً تم بھی مر جاتے۔"

تو کیا، یہ...... یہ طالب علم نے تو نہیں کیا؟" میں چلا اُٹھا۔

"اس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ کیا تم نے یا میں نے اسکو مارا ہے پھر؟......

یہ ہے پڑھے لکھوں کا حال ......اُس نے اس کو بڑی چالاکی سے ہلاک کر دیا ہے اور اپنے دوستوں کو آفت میں پھنسا کر چلتا بنا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ ایسا غدار ثابت ہوگا۔ تو کل ہی میں نے ایک ہی ضرب سے اُسکا کام تمام کر دیا ہوتا...... کنپٹی پر ایک گھونسہ جماتا اور دُنیا سے ایک رزیل اور بدکردار شخص ہمیشہ کے لیے کم ہو جاتا......کیوں اب سمجھے کچھ کہ اُس نے کیا کر دیا ہے؟ اب بہتر یہی ہے۔ کہ یہاں سے بھاگ چلیں، بیشتر اس کے کہ ہمیں کوئی اس میدان میں دیکھ لے......سمجھے کچھ؟ بہت جلد انہیں بڑھئی کی لاش مل جائے گی، اور وہ قاتل کے سُراغ میں مصروف ہو جائیں گے۔ اور ہم ایسے آوارہ گردوں کو پکڑ کر طرح طرح کے سوالات پوچھیں گے، گویا میں اور تم بالکل بے گناہ ہی ہیں...... یہ اور مصیبت ہے کہ اس کی پستول میری جیب میں پڑی ہے۔"

"پھینک دو اسے' پھینک دو!" میں نے اُسے صلاح دی

"پھینک دوں؟" سپاہی نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا" وہ کیوں؟ یہ تو قیمتی چیز ہے۔ شاید یہ ہم بچ نکلیں! نہیں میں تو اُسے ہرگز نہ پھینکوں گا...... اس کی قیمت تین روبل کے قریب ہوگی...... یہ کون معلوم کر سکتا ہے۔ کہ اس بے چارہ کے پاس کوئی ہتھیار بھی تھا یا نہیں...... اس میں ایک گولی بھی ہے......آہ! میں یہ گولی اپنے اس دغاباز دوست کے دماغ میں اتارنے کے لیے کس قدر بے قرار ہوں!......خدا

معلوم وہ اس بے چارے کا کتنا روپیہ لے بھاگا ہے؟......لعنت ہو اس پر!''

اور بیچارے بڑھئی کی لڑکیوں کا کیا حشر ہوگا؟'' میں نے سپاہی سے کہا۔

''لڑکیاں؟...... کس کی لڑکیاں؟ ہاں بڑھئی کی...... کیوں، وہ جوان ہو جائیں گی۔ اور ہم سے تو وہ شادی کرنے سے رہیں...... ہم ان کے متعلق کیوں فکر کریں چلو، بھائی، اب چلیں......مگر جائیں کسطرف؟''

میں نے مڑکر دیکھا، بہت دور ایک سیاہ اور بُلند پہاڑی کے اوپر سُورج چمک رہا تھا۔

کیا دیکھ رہے ہو کہ وہ زندہ تو نہیں ہوگیا؟ بے خوف رہو، اب وُہ اُٹھکر ہمارا پیچھا نہ کرے گا...... یہ اپنے کام کا پورا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو تو اُس نے اس غریب کو کس طرح سرد کیا ہے...... کیسا شاندار رفیق تھا! اس نے ہمارے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا ہے...... آہ! اب اخلاق روز بروز رُوبہ تنزل ہے لوگ بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ سپاہی نے غمگین لہجے میں کہا

خاموش اور سنسان میدان سُورج کی روشنی سے معمور تھا۔ جو ہمارے گردو پیش، افق پر آسمان کی نیلاہٹ کے ساتھ اس دلنواز انداز میں تحلیل ہو رہی تھی کہ اس وقت تمام سیاہ کاریاں اور غیر مُنصفانہ کام میدان کی اس عظیم الشان سادگی اور وسعت میں آسمان کے نیلے گنبد کے نیچے بالکل ناممکن معلوم ہوتے تھے۔

''بھائی، مجھے تو سخت بھُوک لگ رہی ہے!'' میرے ساتھی نے ہاتھ سے سگرٹ بناتے ہوئے کہا۔

''مگر سوال ہے کہ ہم کھائیں گے کیا اور کہاں اور کب کھائیں گے!''

یہی حل طلب چیز تھی......ایک معمّا!

یہاں تک پہنچ کر ہسپتال میں اُس شخص نے جو میرے ساتھ والے بستر پر لیٹا ہوا تھا اپنا قصہ یوں ختم کر دیا۔ یہ داستان کا خاتمہ ہے...... میں اور سپاہی گہرے دوست بن گئے۔ ہم دونوں نے کارس کے علاقے تک ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ وہ ایک رحم

دل اور تجربہ کار آدمی تھا، نظروں میں اُس کی بڑی عزت تھی۔ ایشیائے کوچک پہونچ کر ہم ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

''کیا تمہیں وہ بڑھئی اب بھی یاد آتا ہے؟'' میں نے اُس سے دریافت کیا۔

''جی ہاں۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے آپ نے دیکھا ہے بلکہ جیسا آپ نے سُنا ہے!''

''اور کچھ نہیں، کسی قسم کا احساس بھی نہیں؟''

اس پر وہ ہنسنے لگا۔

''مجھے اس واقعہ کے متعلق کس طرح احساس ہو؟ بڑھئی پر جو کچھ گذرا، اُسکا میں ذمہ دار نہیں اور مجھ پر جو کچھ گذری اُس کے آپ ذمہ دار نہیں اور سچ تو یہ ہے کسی چیز کا کوئی بھی ذمہ دار نہیں...... اس لیے کہ ہم سب یکساں ہیں یعنی درندے!''

میکسم گورکی

مسرت نا آشنا

انگور کی بیلوں کے سبز کاہی پردے سے چھن چھن کر دھوپ کی سنہری بوچھار ہوٹل کے ڈھلواں چبوترے پر برس رہی ہے...... ہوا میں معلق سونے کے تاروں کی مانند۔ بھورے پتھر کی سلوں کے فرش اور سفید میز پوشوں پر عجیب وغریب نقش ونگار کی پرچھائیاں نظر آرہی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کو دیر تک دیکھا جائے تو ان کو ایک نظم کی طرح پڑھنا ممکن ہوسکتا ہے۔ انگوروں کے خوشے دھوپ میں موتیوں کی طرح دمک رہے ہیں یا پھر اس عجیب، بے آب پتھر...... اولیوین*...... کی مانند اور میز پر رکھے ہوئے پانی کے جگ میں نیلگوں ہیرے چمک رہے ہیں۔

میزوں کے درمیان فرش پر ایک چھوٹا سا کروشیا کا بنا ہوا رومال پڑا ہوا ہے۔ ظاہر ہے وہ کسی خاتون نے گرایا ہوگا اور یقیناً وہ ایک آسمانی حسن کی مالک ہوگی۔ اور اس کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا، ایسے گرم، غنائی اور پرسکون دن میں جب کہ ہر عام اور معمولی اور بے کیف چیز سورج کی آب وتاب کے سامنے گویا شرم سے منہ چھپا کر غائب ہو جاتی ہے کچھ اور سوچنا ممکن ہی نہیں ہے۔

ہر طرف سکوت طاری ہے۔ باغ میں چہچہاتی ہوئی چڑیوں کی آواز، پھولوں کے گرد اڑتی ہوئی شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور کہیں پہاڑیوں پر لگے ہوئے انگور کے

* ایک زیتونی رنگ کا قیمتی پتھر۔ (مترجم)

باغوں کی طرف سے آتی ہوئی ایک گیت کی مدہم دُھن، بس ان آوازوں کے سواء اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گانے والے دو ہیں، ایک مرد اور ایک عورت، اور گیت کے ہر دوہے کے بعد ایک منٹ کی خاموشی ہوتی ہے اور پھر دوسرا دوہا شروع ہوتا ہے اور اس نے گیت کو ایک عجیب دعائیہ سی خصوصیت عطا کر دی ہے۔

اور اب ایک خاتون نمودار ہوتی ہے، وہ باغ سے آتے ہوئے سنگ مرمر کے چوڑے زینے پر دھیرے دھیرے چڑھ رہی ہے۔ وہ ایک بوڑھی خاتون ہے، بہت دراز قد، اور اس کے سانولے چہرے پر سختی کا رنگ ہے، اس کی پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں اور اس کے پتلے ہونٹ اس طرح زور سے بھنچے ہوئے ہیں گویا اس نے ابھی ابھی کہا ہو: "نہیں!" اس کے ہڈیالے شانوں پر ایک لمبا چوڑا زرتار ریشم کا کیپ کی طرح کا لبادہ پڑا ہوا ہے جس کے کناروں پر کروشیا کے جھالر لگے ہیں، ایک سیاہ کروشیا کا بنا ہوا رومال اس کے چھوٹے سے سفید سر کو ڈھانپے ہوئے ہے اور وہ اپنے ایک ہاتھ میں ایک لمبے ہنڈل والا چھوٹا سرخ چھاتہ لیے ہوئے ہے اور دوسرے ہاتھ میں نقرئی تاروں سے مزین سیاہ مخملی بٹوا۔ وہ سورج کی کرنوں کے مہین جالے کے درمیان ایک سپاہی کی سی مضبوط چال سے چل رہی ہے اور اس کا چھاتہ ڈھلواں چبوترے کے پتھروں پر زور زور سے لگ رہا ہے۔ ایک رخ سے دیکھنے میں اس کا چہرہ اور بھی زیادہ سخت ہے: اس کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح ہے، ٹھوڑی نکیلی ہے اور اس پر ایک بڑا سا بھورا مسا ہے، ابھری ہوئی پیشانی کے نیچے سیاہ حلقے ہیں اور ان کے اندر آنکھیں جھریوں کے باریک باریک جال میں چھپی ہوئی ہیں اور اتنی اندر دھنسی ہوئی ہیں کہ بوڑھی عورت اندھی معلوم ہوتی ہے۔

اس کے پیچھے ایک کبڑے کا بلخ کی طرح جھوم جھوم کر چلتا ہوا، ناٹا اور موٹا پیکر نمودار ہوتا ہے۔ اس کے بڑے سے ڈھلکے ہوئے سر پر ایک نرم بھورا ہیٹ رکھا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ اس کی واسکٹ کی جیب میں چھپے ہوئے ہیں اور اس وجہ سے وہ جتنا چوڑا اور بے ڈھنگا ہے اس سے بھی زیادہ معلوم ہو رہا ہے۔ وہ ایک سفید سوٹ پہنے ہوئے ہے اور نرم تلوں والے سفید جوتے۔ اس کا منہ نیم وا ہے اور اس کے پیچھے زرد اور

ناہموار دانت نظر آ رہے ہیں۔ اس کے اوپری ہونٹ پر چند سیاہ اور سخت بال ناخوش گوار طریقے سے اگے ہوئے ہیں، وہ زور زور سے اور تکلیف کے ساتھ سانس لے رہا ہے اور اس کے نتھنے پھڑک رہے ہیں لیکن مونچھیں بالکل نہیں ہل رہیں۔ چلتے وقت اس کی چھوٹی ٹانگیں بڑی بری طرح مڑتی ہیں اور اس کی بے حد بڑی آنکھیں بے کیفی سے زمین کو تک رہی ہیں۔ اس کا مختصر سا جسم طرح طرح کی بڑی بڑی اشیاء سے مزین ہے: اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی میں ایک بڑی سی، نگینہ جڑی ہوئی سونے کی انگوٹھی پہن رکھی ہے، ایک سیاہ فیتے کے سرے پر، جو گھڑی کی زنجیر کا کام دیتا ہے، ایک بڑی سی سنہری تختی لٹکی ہوئی ہے اور اس کی نیلی ٹائی میں ایک حد سے زیادہ بڑا دودھیا پتھر لگا ہوا ہے۔ جو منحوس سمجھا جاتا ہے۔

چبوترے پر ایک اور پیکر نظر آتا ہے اور وہ بھی ایک بوڑھی عورت کا ہے۔ وہ پستہ قد اور بالکل گول ہے اور اس کا چہرہ سرخ اور شفقت آمیز ہے اور آنکھیں زندگی سے بھرپور ہیں۔ یقیناً وہ ایک زندہ دل باتونی عورت ہوگی۔

وہ سب چبوترے پر سے ہوتے ہوئے ہوٹل کے دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ وہ ہوگارتھ کی کسی تصویر کے لوگوں سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں: بدصورت، غمگین، مضحکہ خیز اور اس تابندہ آفتاب کے نیچے کی ہر چیز کے لیے اتنے زیادہ اجنبی کہ ان کو دیکھ کر ہر چیز بے کیف، دھندلی اور بے رنگ ہو جاتی ہے۔

وہ بھائی بہن ہیں اور ہالینڈ کے رہنے والے ہیں۔ وہ ایک ہیروں کے سوداگر اور بینکر کی اولاد ہیں اور اگر اس داستان کا یقین کیا جائے جو ان کے متعلق بیان کی جاتی ہے تو ان کی زندگی کی تاریخ بڑی ہی عجیب وغریب ہے۔

بچپن میں کبڑا شرمیلا، خاموش طبیعت اور عالم خیال میں رہنے والا تھا اور اسے کھلونوں سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اس بات کی طرف اس کی بہن کے سواء اور کوئی بالکل دھیان نہیں دیتا تھا۔ اس کے ماں باپ کا خیال تھا کہ ایک بدقسمت مخلوق کے لیے اس قسم کا رویہ بالکل فطری ہے لیکن بچی جو اس سے چار سال بڑی تھی اپنے

بھائی کے عجیب وغریب طور طریقوں سے پریشان رہتی تھی۔

وہ اپنا تقریباً تمام وقت اس کے ساتھ گزارتی تھی اور اس کا دل بہلانے اور اسے ہنسانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ وہ اسے کھیلنے کے لیے کھلونے دیتی تھی اور کبڑا ایک کے اوپر ایک رکھ کران کا اہرام سا بنا دیتا تھا۔ بہن نے اسے شاید ہی کبھی مسکراتے ہوئے دیکھا ہو۔ عام طور پر وہ اسے بھی اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے انہی بے کیف اور خالی خالی نگاہوں سے دیکھتا تھا جن سے وہ اپنے گردو پیش کی ہر چیز کو تکتا تھا۔ ان نگاہوں سے بہن جھنجلاسی جاتی تھی۔

''تم ان نگاہوں سے مجھے دیکھنے کی جرأت مت کرو، تم بڑے ہو کر بالکل لاحمق نکلو گے!'' وہ زمین پر پاؤں مار مار کر چلاتی تھی۔ وہ اس کے چٹکیاں لیتی تھی اور تھپڑ مارتی تھی اور وہ روتا اور بسورتا تھا اور اپنے سر کو چھپانے کے لیے اپنے لمبے پتلے بازوؤں کو اوپر اٹھا لیتا تھا لیکن وہ کبھی بہن کے سامنے سے بھاگتا نہیں تھا اور نہ ہی کبھی کسی سے شکایت کرتا تھا۔

بعد میں، جب لڑکی کو یہ خیال ہوا کہ اب اس کا بھائی بھی اس بات کو سمجھ سکے گا جو خود اس کے لیے روز روشن کی طرح صاف تھی، تو اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی:

''جبکہ تم میں جسمانی خرابی ہے تو تمہیں عقل مند ہونا چاہیے ورنہ ہم سب...... ماں، ابا اور سب لوگ...... تمہاری وجہ سے شرمندہ ہوں گے! یہاں تک کہ ملازموں کو بھی ایک ایسے دولت مند گھر میں ملازمت کرتے ہوئے شرم محسوس ہوگی جہاں ایک چھوٹا سا عجیب الخلقت بچہ موجود ہو۔ ایک دولت مند گھر میں ہر چیز میں خوبصورتی ہونی چاہیے یا عقل مندی، سمجھے؟''

''ہاں'' اس نے اپنے بڑے سے سر کو ایک طرف جھکا کے اور اپنی بے جان، تاریک نگاہ اس پر گاڑ کر سنجیدگی سے جواب دیا۔

ماں اور باپ اس چھوٹی لڑکی کا اپنے بھائی کے ساتھ یہ رویہ دیکھ کر بہت خوش

تھے اور وہ لڑکے کی موجودگی میں لڑکی کی نرم دلی کی تعریف کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ لڑکی ننھے کبڑے کی مانی ہوئی ساتھی بن گئی۔ وہ اسے کھلونوں سے کھیلنا سکھاتی تھی، اس کے سبق تیار کراتی تھی اور اسے پریوں اور شہزادوں کی داستانیں پڑھ کر سناتی تھی۔

لیکن وہ اسی طرح اپنے کھلونوں کے اونچے اونچے ڈھیر بناتا رہا گویا وہ کہیں بلندی پر پہنچنا چاہتا ہو، اور وہ اپنی پڑھائی میں کوئی دل چسپی نہیں لیتا تھا۔ صرف پریوں کی کہانیوں کے کرداروں کے حیرت انگیز کارنامے ہی اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ لا سکتے تھے۔ ایک دن اس نے اپنی بہن سے پوچھا:

''کیا کبھی شہزادے بھی کبڑے ہوتے ہیں؟''

''نہیں۔''

''اور بانکے سورما؟''

''ظاہر ہے نہیں!''

لڑکے نے تھکے ہوئے انداز میں ٹھنڈا سانس بھرا اور اس کی بہن نے اس کے سخت بالوں پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''مگر عقل مند جادوگر ہمیشہ کبڑے ہوتے ہیں۔''

''تو پھر میں جادوگر بنوں گا۔'' اس نے مسکینی سے کہا اور پھر کچھ سوچ کر اتنا اور پوچھا:

''پریاں ہمیشہ خوبصورت ہوتی ہیں نا؟''

''ہمیشہ۔''

''تمہاری طرح؟''

''شاید! لیکن میرا خیال ہے کہ مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت۔'' اس نے ایمان داری سے جواب دیا۔

جب وہ آٹھ سال کا تھا تو اس کی بہن نے غور کیا کہ جب کبھی وہ پیدل یا گاڑی میں کسی بنتی ہوئی عمارت کے پاس سے گزرتے تھے تو لڑکے کا چہرہ فرط حیرت

سے چمک اٹھتا تھا اور وہ کام کرتے ہوئے لوگوں کو بڑی پر اشتیاق محویت سے دیکھتا تھا اور پھر اپنی بے کیف آنکھوں میں ایک سوالیہ کیفیت لئے ہوئے اپنی بہن کی طرف مڑتا تھا۔

''اس میں تمہیں دل چسپی ہے؟'' بہن نے اس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیوں؟''

''یہ میں نہیں جانتا۔''

لیکن ایک دن اس نے اس کی وضاحت کی: ''اتنے چھوٹے چھوٹے آدمی اور ایسی چھوٹی چھوٹی اینٹیں لیکن وہ کس قدر بڑے بڑے مکان تعمیر کرتے ہیں۔ کیا پورا شہر اسی طرح بنا تھا؟''

''ہاں ظاہر ہے۔''

''ہمارا مکان بھی؟''

''ہاں اور کیا!''

اس کو دیکھتے ہوئے لڑکی نے مضبوطی سے کہا: ''بڑے ہو کر تم ایک مشہور ماہر تعمیر بنو گے!''

اسے لکڑی کے بلاک بہت بڑی تعداد میں خرید کر دے دیے گئے اور اس دن سے اس کے دل میں تعمیر کے لیے ایک شدید اور پر شوق جذبہ بھڑک اٹھا۔ کئی کئی دن تک متواتر وہ اپنے کمرے کے فرش پر بیٹھا خاموشی سے اونچے مینار بنایا کرتا تھا اور جب وہ دھڑام سے نیچے گر پڑتے تھے تو وہ انہیں نئے سرے سے بناتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ چیز اس کے لیے اتنی ضروری ہوگئی کہ وہ کھانے کے وقت بھی چھری کانٹوں اور نیپکن کے چھلوں سے کچھ نہ کچھ بنانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں زیادہ گہرائی پیدا ہوگئی اور اس کی نظروں میں ٹھہراؤ اور توجہ، اس کے ہاتھوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی اور وہ مسلسل متحرک رہنے لگے اور اس کی انگلیاں ہر اس چیز کو کھوجنے اور ٹٹولنے لگیں جوان کی

پنجے میں تھی۔

اب وہ شہر میں چہل قدمی کرتے وقت گھنٹوں کھڑا ہو کر تعمیر ہوتے ہوئے مکانوں کو دیکھتا، ان کے آہستہ آہستہ زمین سے اٹھ کر آسمان کی طرف بلند ہونے کا نظارہ دیکھنا بہت پسند کرتا۔ وہ پھڑکتے ہوئے نتھنوں کے ساتھ ندیدیوں کی طرح اینٹوں کی گرد اور ابلتے ہوئے چونے کی خوشبو کو گہرے گہرے سانسوں کے ذریعے پیتا تھا، اس کی آنکھوں میں نیند کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی اور ان پر ایک خواب آلود غور وفکر کا پردہ سا پڑ جاتا تھا۔ اور جب اس سے کہا جاتا تھا کہ اس طرح کھڑے ہو کر تکنا ٹھیک نہیں ہے تو وہ یہ بات سنتا ہی نہیں تھا۔

''چلو!'' اس کی بہن اس کا ہاتھ کھینچ کر اصرار کرتی تھی۔

وہ اپنا سر جھکا لیتا تھا اور آگے چل پڑتا تھا لیکن بار بار پیچھے مڑ کر دکھتا رہتا تھا۔

''تم ماہر تعمیر بنو گے نا؟'' اس کی بہن اس سے اکثر پوچھا کرتی تھی۔

''ہاں۔''

ایک دن جب وہ دوپہر کے کھانے کے بعد ملاقاتی کمرے میں بیٹھے قہوہ کا انتظار کر رہے تھے تو باپ نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ لڑکا کھلونوں سے کھیلنا چھوڑ دے اور سنجیدگی سے پڑھائی شروع کرے، لیکن اس کی بہن نے ایک ایسے شخص کے سے لہجے میں کہا جس کی رائے کا احترام نہ کرنا اور جس کو اہمیت نہ دینا ناممکن ہے:

''ابا مجھے امید ہے کہ آپ اسے کسی اسکول میں بھیجنے کا خیال نہیں کر رہے ہیں!''

باپ نے، جو ایک لمبا چوڑا، ڈاڑھی مونچھ صاف آدمی تھا اور جس کے جسم کے مختلف حصوں کو چمکتے دمکتے ہیرے جواہرات کی بہت بڑی تعداد نے مزین کر رکھا تھا، اپنا سگار سلگایا۔

''اور میں بھلا کیوں یہ خیال نہ کروں؟''

''آپ خود اچھی طرح جانتے ہیں کہ کیوں۔''

چونکہ وہ لوگ اس کے متعلق بات چیت کر رہے تھے اس لیے کبڑا خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ نکلتے نکلتے اس نے اپنی بہن کو کہتے سنا:

''لیکن ہر شخص اس کا مذاق اڑائے گا!''

''ہاں ہاں یہ تو ظاہر ہے!'' ماں نے خزاں کی ہوا کی سی بھیگی بھیگی، بھاری آواز میں کہا۔

''اس کی طرح کے لوگ تو چھپا کر رکھنے چاہئیں!'' بہن نے شدید جذبہ کے ساتھ کہا۔

''ہاں اور کیا، اس پر بھلا فخر کیسے کیا جا سکتا ہے۔'' ماں نے کہا ''اس ننھے سے سر میں کتنی عقل بھری ہوئی ہے!''

''ہاں تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔'' باپ نے اتفاق کیا۔

''لیکن یہ کتنی عقل مند ہے!''

کبڑا دروازے کے پاس آ کر بولا:

''اور میں بھی بیوقوف نہیں ہوں......''

''دیکھتے ہیں'' باپ نے کہا اور ماں بولی ''کوئی تمہیں بے وقوف نہیں سمجھتا......''

''تم گھر پر پڑھو گے'' اس کی بہن نے اسے اپنے برابر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم ہر وہ چیز سیکھو گے جو ایک ماہر تعمیر کو سیکھنی چاہیے۔ تمہیں یہ چیز پسند ہے؟''

''ہاں۔ تم دیکھو گی''

''میں کیا دیکھوں گی۔''

''کہ مجھے کیا پسند ہے۔''

وہ قد میں اس سے ذرا ہی نکلتی ہوئی تھی، کوئی چند انگل زیادہ، لیکن اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اور ہر شخص سے، یہاں تک کہ اس کے ماں باپ سے بھی، کہیں زیادہ لمبی ہے۔ اس وقت وہ پندرہ سال کی تھی۔ کبڑا ایک کیکڑے سے مشابہ تھا اور وہ......لمبی،

چھریری اور مضبوط......اسے ایک دلکش پری معلوم ہوتی تھی جس نے خود اس کو اور پورے گھر کو اپنے سحر سے مسخر کر رکھا تھا۔

اور اب کبڑے کے پاس سرد مہر اور مہذب قسم کے لوگ باقاعدگی سے آنے لگے جو اسے کچھ سکھانے کی کوشش کرتے تھے، صبر سے اس کو مختلف باتیں سمجھاتے تھے اور اس سے سوالات کرتے تھے لیکن کبڑا ڈھٹائی سے اعتراف کرتا تھا کہ وہ اپنے استادوں کی بتائی ہوئی آدھی بات بھی نہیں سمجھتا اور وہ سرد مہری سے انہیں تکتا رہتا تھا اور اس دوران میں اپنے خیالات میں محو رہتا تھا۔ وہ بہت کم بولتا تھا لیکن بعض اوقات عجیب عجیب سوال کر ڈالتا تھا:

''جو لوگ کچھ بھی نہیں کرنا چاہتے ان کا کیا حشر ہوتا ہے؟''

اس کے استاد نے، جو ایک انتہائی شائستہ اور مہذب قسم کا آدمی تھا اور ایک گلا بند سیاہ کوٹ میں ملبوس بہ یک وقت پادری اور سپاہی سے مشابہت رکھتا تھا، جواب دیا:

''ان لوگوں کا انجام بدترین ہوتا ہے! مثلاً! ان میں سے اکثر سوشلسٹ بن جاتے ہیں۔''

''شکریہ۔'' کبڑے نے کہا۔ وہ اپنے استاد سے ایک بڑے آدمی کی سی روکھی شائستگی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ ''اور سوشلسٹ کیا ہوتا ہے؟''

''بہترین صورتوں میں وہ ایک خوابوں کی دنیا کا باسی اور وقت گنوانے والا ہوتا ہے اور علمی طور پر وہ ایک ذہنی مفلوج ہوتا ہے جو خدا، ملکیت اور وطن کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔''

اس کے استاد ہمیشہ مختصر جواب دیتے تھے اور ان کے جواب اس کے حافظے میں اس طرح پیوست ہو جاتے تھے جیسے فٹ پاتھ پر پتھر۔

''کیا ایک بوڑھی عورت بھی ذہنی مفلوج ہو سکتی ہے؟''

''ہاں اور کیا......''

''اور ایک کم عمر لڑکی بھی؟''

''ہاں...... یہ ایک پیدائشی چیز ہے۔''

اس کے استاد کا اس کے متعلق کہتے تھے: ''اس میں ریاضی کی صلاحیت تو بہت کم ہے لیکن یہ اخلاقیات کے مسائل میں بہت گہری دل چسپی کا اظہار کرتا ہے۔''

''تم باتیں بہت کرتے ہو'' جب اس کی بہن کو اس کی اور اس کے استادوں کی باہمی گفتگو کا علم ہوا تو اس نے یہ بات کہی۔

''وہ مجھ سے زیادہ باتیں کرتے ہیں۔''

''تم دعا مانگنے کی کافی کوشش نہیں کرتے ہو۔''

''خدا میرے کب کو ٹھیک نہیں کر دے گا۔''

''اوہو تو تم اب اس کے متعلق سوچ رہے ہو؟'' وہ حیرت زدہ ہو کر چلائی۔ ''اس دفعہ تو میں تمہیں معاف کرتی ہوں'' اس نے اعلان کیا ''لیکن تمہیں اس قسم کے خیالات کو ہمیشہ کے لیے اپنے دماغ سے نکال دینا ہے، سن رہے ہو؟''

''ہاں۔''

اب وہ لمبے لباس پہننے لگی تھی اور اس کا بھائی تیرہ سال کا ہو گیا تھا۔

اس دن سے کبڑا اپنی بہن کو بہت پریشان کرنے لگا۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوتا ہو کہ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی ہو اور کوئی بورڈ یا تختہ یا اوزار اس کے سر اور شانوں اور ہاتھوں پر نہ آگرا ہو۔ کبڑا ہمیشہ اسے زور سے خبر دار کر دیتا تھا: دیکھ کر آؤ!'' لیکن وہ ہمیشہ ایک منٹ دیر سے کہتا تھا اور لڑکی کے اکثر چوٹ لگ جاتی تھی۔

ایک دفعہ، شدت درد سے لنگڑاتی ہوئی وہ اس کے اوپر جھپٹی...... اس وقت مارے غصے کے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا...... اور چلائی:

''تم یہ جان بوجھ کر کر رہے ہو، کبڑے!'' اور اس نے کبڑے کے تھپڑ مار دیا۔

اس کی ٹانگیں کمزور تھیں، وہ گر پڑا اور فرش پر بیٹھے بیٹھے اس نے کسی قسم کی خفگی

ظاہر کیے یا آنسو بہائے بغیر دھیرے سے کہا: "تم یہ کیسے سمجھ سکتی ہو؟ تم مجھ سے محبت کرتی ہو نا؟ کرتی ہو نا تم مجھ سے محبت؟"

وہ درد کے سبب کراہتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ معذرت کرنے کے لیے واپس آئی۔

"اصل بات یہ ہے" اس نے صفائی پیش کی "تم نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا تھا......"

"پہلے میرے پاس یہ سب چیزیں نہیں تھیں" اس نے ہاتھ سے ایک ہمہ گیر سا اشارہ کرتے ہوئے پرسکون انداز میں جواب دیا۔ اس اشارے نے پورے کمرے کو محیط کر لیا جس میں کونوں میں رکھے ہوئے بورڈ، نجاری کی میز پر ڈھیروں لکڑی کے تختے، دیوار کے پاس رکھی ہوئی خراد، یہ سب انتہائی بے ترتیبی سے پڑی ہوئی چیزیں شامل تھیں۔

"تم نے یہ سب فضولیات یہاں کیوں بھر لی ہیں؟" بہن نے کراہیت اور شبہ سے اپنے گردوپیش نظر دوڑاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تم دیکھ لوگی!"

اس نے چیزیں بنانی شروع کر دی تھیں۔ اس نے ایک خرگوش رکھنے کا صندوق اور ایک کتا بھی بنا لیا تھا اور اب وہ ایک نئے قسم کے چوہے دان پر کام کر رہا تھا۔ اس کی بہن اس کے کام کی ترقی کو بڑے شوق سے دیکھتی تھی اور کھانے کے وقت وہ اپنے ماں باپ کے سامنے بہت فخریہ اس کی کامیابیوں کا ذکر کرتی تھی۔ باپ پسندیدگی سے سر ہلا کر کہتا تھا:

"سب کچھ شروع چھوٹی چیزوں سے ہوتا ہے۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے!"

اور ماں اپنی بیٹی کو گلے لگا کر بیٹے سے کہتی تھی "تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تم پر اس کا کتنا زبردست احسان ہے؟"

"ہاں" کبڑا جواب دیتا تھا۔

جب چوہے دان تیار ہو گیا تو اس نے اپنی بہن کو بلایا اور اسے اپنی یہ بھدی سی انوکھی مشین دکھائی۔

''یہ کوئی کھلونا نہیں ہے'' اس نے کہا ''اس کو تو پیٹنٹ کرایا جا سکتا تھا۔ دیکھو یہ کتنی سادہ اور زوردار چیز ہے۔ اپنی انگلی یہاں رکھو۔''

لڑکی نے اسے چھوا اور کوئی چیز کھٹ سے بند ہوئی۔ وہ چیخ پڑی اور کبڑا اس کے پاس کھڑا اچھلتا اور بڑبڑاتا رہا ''اوہ یہ غلط ہے، غلط ہے......''

ماں دوڑی ہوئی آئی اور پھر ملازم بھی دوڑے۔ انہوں نے چوہے دان کے مختلف حصوں کو الگ الگ کیا۔ لڑکی کی بھنچی ہوئی نیلی انگلی نکالی اور اسے بے ہوشی کے عالم میں وہاں سے لے گئے۔

اس شام کو اس کی بہن نے اسے بلایا اور اس سے پوچھا:

''تم نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی۔ تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ کیوں؟''

اس نے اپنا کب ہلاتے ہوئے نیچی اور پرسکون آواز میں کہا:

''تم نے اسے غلط سے ہاتھ سے چھوا، بس اور کوئی بات نہیں۔''

''یہ جھوٹ ہے!''

''لیکن ......لیکن میں تمہارے ہاتھ کو مسخ کیوں کرنا چاہوں گا؟ اور پھر یہ تو وہ ہاتھ بھی نہیں تھا جس سے تم نے مجھے مارا تھا......''

''دیکھو، کبڑے تم مجھے چٹکیوں میں نہیں اڑا سکتے!''

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے اتفاق کیا۔

اس کا نکیلا چہرہ ہمیشہ کی طرح پرسکون تھا اور اس کی آنکھوں میں غور و فکر کا رنگ تھا، یہ خیال کرنا ناممکن تھا کہ وہ خفا ہے یا یہ کہ وہ جھوٹ بول سکتا ہے۔

اس واقعے کے بعد لڑکی نے اس کے کمرے میں آنا جانا کم کر دیا۔ اس کی سہیلیاں اس سے ملنے آتی تھیں بشاش، خوش دل، نوجوان لڑکیاں، بھڑکیلے کپڑوں میں ملبوس، ان بڑے بڑے اور کچھ ٹھنڈے اور بے رنگ سے کمروں میں تیتریوں کی طرح

اڑتی پھرتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی موجودگی میں تصویریں، مجسمے، پھول اور ملمع دار آرائشی اشیاء، سب چیزیں کچھ پہلے سے زیادہ گرم ہو گئی ہیں۔ بعض دفعہ لڑکے کی بہن اپنی سہیلیوں کو اس کے کمرے میں لے آتی تھی۔ وہ بڑے مقطع انداز سے اپنی گلابی ناخنوں والی چھوٹی چھوٹی انگلیاں اس کی طرف بڑھاتی تھیں اور اس کے ہاتھ کو اس احتیاط سے چھوتی تھیں گویا انہیں ڈر ہو کہ کہیں وہ ٹوٹ نہ جائے۔ وہ اس سے بہت نرمی سے بات کرتی تھیں اور وہ تجسس آمیز دلچسپی کے ساتھ کبڑے کے اپنے اوزاروں، ڈرائنگ، لکڑی کے ٹکڑوں اور برادے سے گھرا ہوا ہونے کے نظارے کو دیکھتی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ یہ لڑکیاں اسے "موجد" کہتی ہیں، یہ اس کی بہن کی کوشش کا نتیجہ تھا، اور وہ جانتا تھا کہ ان سب کو توقع ہے کہ وہ مستقبل میں کوئی بڑا کام کر کے دکھائے گا جو اس کے باپ کا نام روشن کرے گا۔ اس کی بہن ہمیشہ بڑے وثوق اور اعتماد کے ساتھ اس موضوع پر بات کرتی تھی۔

"وہ ظاہر ہے بدصورت تو ہے لیکن عقل مند بہت ہے۔" وہ اکثر کہا کرتی تھی۔

وہ اب انیس سال کی تھی اور جب اس کے ماں باپ کشتی پر ایک تفریحی سفر کرتے ہوئے ختم ہو گئے، کیونکہ ایک امریکی سامان کے جہاز کے بدمست سکان گیر نے اپنے جہاز کو ان کی کشتی سے ٹکرا کر اسے ڈبو دیا تھا، تو اس وقت اس کا ایک خواستگار بھی پیدا ہو چکا تھا۔ وہ بھی اس کشتی میں ان کے ساتھ جانے والی تھی لیکن دانت کے درد کی وجہ سے اسے گھر ہی پر رہنا پڑا۔

جب اسے اپنے والدین کی موت کی اطلاع ملی تو وہ اپنا دانت کا درد بھول گئی اور کمرے میں دیوانہ وار روتی اور ہاتھ ملتی ادھر سے ادھر دوڑنے لگی:

"نہیں، نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، ہرگز نہیں ہو سکتا!"

کبڑا، جو پردے میں لپٹا ہوا سا دروازے پر کھڑا تھا، لڑکی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور اپنا کب ہلاتا رہا۔ آخر کار وہ بولا۔

''ابا تو اس قدر گول اور کھو کھلے تھے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا وہ ڈوب کس طرح گئے......''

''خاموش رہو، تم کسی سے محبت نہیں کرتے ہو!'' اس کی بہن چلائی۔

''فقط یہ بات ہے کہ میں میٹھے میٹھے الفاظ کہنا نہیں جانتا؟'' اس نے کہا۔

باپ کی لاش بالکل نہیں مل سکی لیکن ماں پانی کے اندر جانے سے پہلے ہی مرگئی تھی اور اس کی لاش مل گئی تھی۔ وہ اپنے تابوت میں بالکل اسی طرح لیٹی ہوئی تھی جیسی وہ زندگی میں تھی......ایک پرانے درخت کی مردہ شاخ کی مانند سوکھی اور سخت۔

''اب میں اور تم اکیلے رہ گئے ہیں۔'' ماں کے کفن دفن کے بعد بہن نے اپنے بھائی کو اپنی سرد، بھوری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ ہمارے لیے بڑی کٹھن چیز ہوگی۔ ہم کچھ نہیں جانتے اور بہت ممکن ہے کہ ہم بہت کچھ کھو دیں۔ کتنی بری بات ہے کہ میں فوراً شادی نہیں کرسکتی!''

''اوہ'' کبڑا چلایا۔

''اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

اس نے ایک منٹ سوچا اور پھر بولا: ''ہم اکیلے ہیں۔''

''تم تو یہ اس طرح کہہ رہے ہو جیسے اس سے تمہیں خوشی ہو رہی ہو!''

''مجھے کسی چیز سے خوشی نہیں ہوتی۔''

''یہ بہت ہی بری بات ہے۔ تم تو ایک جیتے جاگتے انسان سے بہت ہی مختلف ہو!''

شام کے وقت اس کا منگیتر اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ وہ ایک مختصر اور زندہ دل آدمی تھا، سنہری بال، گول گول سنولایا ہوا چہرہ اور گھنی مونچھیں۔ وہ پوری شام ان تھک طریقے پر ہنستا رہتا تھا اور یقیناً پورے دن بھی اسی طرح ہنس سکتا ہوگا۔ ان لوگوں کی منگنی ہوچکی تھی اور شہر کی ایک بہترین سڑک پر ان کے لیے ایک مکان بن رہا تھا، کبڑا کبھی جائے تعمیر پر نہیں گیا تھا اور وہ اس کا ذکر سننا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی بہن کا منگیتر

اپنا چھوٹا، موٹا اور انگوٹھیوں سے بھرا ہوا ہاتھ اس کے کندھے پر مار کر ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ، جس سے اس کے چھوٹے چھوٹے دانتوں کی بتیسی پوری نظر آجاتی تھی، اس سے کہتا تھا: ''تمہیں چل کر اسے دیکھنا چاہئے۔ کیوں، کیا خیال ہے تمہارا؟''

بہت دن تک کبڑا طرح طرح کے عذر تراش کر جانے سے انکار کرتا رہا لیکن آخر کار وہ مان گیا اور اپنی بہن اور اس کے منگیتر کے ساتھ جائے تعمیر پر گیا۔ دونوں مرد مچان پر چڑھے لیکن چوٹی پر پہنچتے ہی وہ گر پڑے۔ منگیتر سیدھا چونے کی ایک ناند میں جا گرا لیکن بھائی کے کپڑے ایک آگے کو نکلے ہوئے تختے میں الجھ گئے اور وہ ہوا میں معلق ہو گیا اور جب تک کہ راج مزدوروں نے اسے وہاں سے نہیں ہٹایا وہ اسی طرح لٹکا رہا۔ اس کی فقط ٹانگ اور بازو کی ہڈی اتر گئی اور چہرے پر کچھ خراشیں پڑ گئیں لیکن منگیتر کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور ایک طرف کی پسلیاں چکنا چور ہو گئیں۔

بہن کو تشنج کے دورے پڑ گئے۔ وہ زمین پر پڑی ہوئی اپنے ناخنوں سے زمین کھرچنے لگی اور اس سے سفید گرد و غبار کا ایک بادل سا پھیل گیا۔ وہ بہت دن تک روتی رہی، ایک مہینے سے زیادہ روئی، اور پھر اس کے بعد وہ اپنی ماں کی طرح سوکھی اور دبلی ہو گئی اور اس کی آواز میں بھی وہی ٹھنڈا پن اور وہی بھاری پن پیدا ہو گیا۔

''تم تو میری کھوٹی تقدیر ہو!'' وہ کہتی تھی۔

کبڑا خاموشی سے زمین کو تکتا رہتا تھا۔ اس کی بہن نے ہمیشہ کے لیے سیاہ لباس اختیار کر لیا، اس کی پیشانی پر مستقل بل رہنے لگے اور جب وہ اپنے بھائی کو دیکھتی تھی تو اتنے زور سے دانت بھینچتی تھی کہ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آتی تھیں۔ کبڑا حتی الامکان اس سے دور دور رہنے کی کوشش کرتا تھا اور خاموشی سے، الگ تھلگ اپنی ڈرائنگ میں مصروف رہتا تھا۔ وہ دونوں اسی طرح رہتے رہے یہاں تک کہ کبڑا سن بلوغ کو پہنچ گیا اور اس دن سے تو ان لوگوں کے درمیان کھلی جنگ چھڑ گئی۔ ان کی پوری زندگیاں اس جنگ کے لیے وقف تھیں اور یہ انہیں باہمی توہین اور تذلیل کے مضبوط بندھن میں باندھے ہوئے تھی۔

جس دن کبڑا بالغ ہوا اس نے اپنی بہن سے تحکمانہ لہجے میں کہا:

"عقل مند جادوگروں اور نیک پریوں کا کوئی وجود نہیں ہے، اس دنیا میں صرف انسان بستے ہیں۔ بعض برے ہیں بعض بے وقوف ہیں۔ اور نیک دلی کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ سب پریوں کی داستان ہے! لیکن میں اس پریوں کی داستان کو عملی شکل دینا چاہتا ہوں۔ تمہیں یاد ہے تم نے کیا کہا تھا: ایک دولت مند گھر میں ہر چیز میں خوبصورتی ہونی چاہئے یا عقل مندی؟ ایک دولت مند شہر میں بھی ہر چیز خوبصورت ہونی چاہئے۔ میں شہر سے باہر زمین کا ایک قطعہ خرید رہا ہوں اور وہاں میں اپنے اور اپنے جیسے دوسرے عجیب الخلقت اور مفلوج لوگوں کے لیے ایک مکان بناؤں گا۔ میں انہیں اس شہر سے باہر لے جاؤں گا یہاں رہنا ان کے لیے تکلیف دہ ہے اور جہاں وہ تمہارے جیسے لوگوں کی طبع نازک پر بار ہیں!"

"نہیں!" اس نے کہا "تم ایسا نہیں کر سکتے! یہ بالکل دیوانہ پن ہے!"

"یہ خود تمہارا خیال ہے۔"

وہ معقولیت اور ٹھنڈے پن سے بحث کرتے رہے..... جیسا وہ لوگ کرتے ہیں جو ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں اور جنہیں اپنی نفرت کو چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

"یہ طے ہے۔" کبڑے نے کہا۔

"میں نے طے نہیں کیا" اس کی بہن نے جواب دیا۔

اس نے اپنا کپ اوپر اٹھایا اور باہر چلا گیا۔ اور کچھ ہی عرصے بعد اس کی بہن نے سن لیا کہ اس نے زمین خرید لی ہے اور نیویں کھودی جا رہی ہیں اور اینٹیں، پتھر، لکڑی اور لوہا گاڑیوں میں بھر بھر کر لے جایا جا رہا ہے۔

"تم اب تک اپنے آپ کو ایک نو عمر لڑکا ہی سمجھتے ہو؟ بہن نے کہا "کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ کوئی کھیل ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہفتے میں ایک دفعہ اس کی بہن..... تیر کی طرح سیدھی اور مغرور..... ایک سفید گھوڑا جتی ہوئی چھوٹی سی گاڑی میں بیٹھ کر، جسے وہ خود ہی چلاتی تھی، شہر کے باہر جایا کرتی تھی اور جائے تعمیر کے قریب آہستہ آہستہ گاڑی چلاتی ہوئی وہ ٹھنڈے پن سے لال لال گوشت کی سی اینٹوں کو لوہے کی کڑیوں کی نسوں میں پھنستا ہوا اور زرد لکڑی کو اس بھاری تودے میں اعصاب کی طرح گزرتا ہوا دیکھتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے دور سے اپنے بھائی کو کیکڑے کی طرح مچان پر رینگتے ہوئے دیکھا، وہ ہاتھ میں چھڑی لیے ہوئے تھا اور اس کے سر پر ایک مسلا ہوا ہیٹ رکھا تھا۔ وہ ایک مکڑی کا سا گرد آلود اور بھورا معلوم ہو رہا تھا۔ بعد میں گھر پر اس نے غور سے اپنے بھائی کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں جو پر جوش اور جاندار معلوم ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ نرم اور روشن ہو گئی تھیں۔

''میں کہتا ہوں تم سے کہ میرا یہ خیال بہت ہی زور دار خیال ہے۔'' اس نے کہا' یہ ہمارے لیے اچھا ہے اور تمہارے لیے بھی! تعمیر بہت ہی اچھی چیز ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جلد ہی میں اپنے آپ کو ایک مسرور انسان سمجھنے کے قابل ہو جاؤں گا۔''

''مسرور؟'' بہن نے ایک پراسرار نگاہ سے اس کے مسخ جسم کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی بات دہرائی۔

''ہاں! تم جانتی ہو کہ جو لوگ کام کرتے ہیں وہ ہم سے بالکل مختلف ہیں، وہ آدمی کے دل میں عجیب عجیب احساسات پیدا کرتے ہیں۔ ایک معمار ہونا اور اس گھر کی سڑکوں پر سے گزرنا جس میں اس نے درجنوں گھر بنائے ہیں کتنی عمدہ چیز ہے! مزدوروں کے درمیان سوشلسٹوں کی کافی تعداد ہے۔ وہ سنجیدہ اور سمجھ دار لوگ ہیں اور مجھے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی خود داری اور احساس وقار بہت مضبوط ہے۔ بعد دفعہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے ہی آدمیوں کے متعلق بہت کم جانتے ہیں......''

''یہ بڑی عجیب وغریب گفتگو ہے۔'' اس کی بہن نے اظہار خیال کیا۔

کبڑا روز بروز زیادہ شگفتہ، زندہ دل اور باتونی ہوتا چلا گیا۔

''سچ تو یہ ہے کہ ہر چیز اسی طرح آگے بڑھ رہی ہے جیسا تم چاہتی تھیں'' اس نے اپنی بہن سے کہا ''میں وہ عقل مند جادوگر ثابت ہوں گا جو اپنے شہر کو عجیب الخلقت لوگوں سے پاک صاف کرے گا۔ تم اگر چاہو تو نیک پری بن سکتی ہو۔ تم جواب کیوں نہیں دیتیں؟''

''ہم اس کے متعلق بعد میں بات کریں گے۔'' اس نے اپنی طلائی گھڑی کی زنجیر سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔

ایک دن اس نے اپنی بہن سے ایک ایسی زبان میں بات کی جو بہن کے لیے بالکل نئی تھی۔

''شاید میں تمہارا اس سے بھی زیادہ گناہ گار ہوں جتنی تم میری ہو......''

وہ حیران رہ گئی۔

''میں......تمہاری گناہ گار!''

''ٹھہرو! میں قسم کھاتا ہوں کہ میرا قصور اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا تم سمجھتی ہو! میری ٹانگیں لڑکھڑا جاتی ہیں اور شاید میں نے واقعی اس وقت اسے دھکا دیا تھا لیکن یقین مانو کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا! اس سے کہیں زیادہ تو میں ان کے لیے قصوروار ہوں کہ میں نے تمہارے اس ہاتھ کو مسخ کرنے کی کوشش کی جس سے تم نے مجھے مارا تھا......''

''ہم اس موضوع پر بات نہیں کریں گے'' اس نے کہا۔

''ہمیں ایک دوسرے سے لطف و عنایت کے ساتھ پیش آنا چاہیے'' کبڑا منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ لطف و محبت محض خواب ہی نہیں ہے، وہ ممکن بھی ہے......''

شہر کے باہر کی وسیع عمارت حیرت انگیز تیزی سے بڑھ رہی تھی، وہ زرخیز زمین پر پھیلتی چلی گئی اور آسمان سے باتیں کرنے لگی جس کا رنگ ہمیشہ خاکستری رہتا تھا

اور جو ہمیشہ بارش کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔

ایک دن افسروں کا ایک گروپ جائے تعمیر پر آیا۔ انہوں نے عمارت کا معائنہ کیا، خاموشی سے آپس میں بات چیت کی اور کام بند کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

"یہ تمہاری حرکت ہے!" کبڑا چلایا۔ وہ اپنی بہن پر جھپٹ پڑا اور طیش کے عالم میں اس نے اپنے لمبے اور طاقت ور ہاتھوں سے اس کو گلے سے دبوچ لیا۔ لیکن لوگ کہیں سے نمودار ہو گئے اور انہوں نے اسے اس کی بہن سے الگ کر دیا۔

"آپ دیکھتے ہیں، حضرات" اس نے ان لوگوں سے کہا "یہ واقعی نارمل نہیں ہے اور اسے ایک سرپرست کی ضرورت ہے! ہمارے باپ کی، جس سے یہ والہانہ محبت کرتا تھا، موت کے کچھ ہی عرصے بعد سے اس کی یہ کیفیت شروع ہوئی۔ آپ لوگ ملازمین سے دریافت کر سکتے ہیں، وہ سب اس کی بیماری کے متعلق جانتے ہیں۔ انہوں نے آج تک منہ سے بھاپ بھی نہیں نکالی کیونکہ وہ اچھے لوگ ہیں اور اس گھر کی عزت اور ناموس انہیں عزیز ہے جس میں ان میں سے اکثر بچپن سے اب تک رہتے آئے ہیں۔ میں نے بھی اپنی بدقسمتی کو ابھی تک چھپائے رکھا کیونکہ بہر حال اگر کسی کا بھائی پاگل ہو تو یہ کوئی قابل فخر بات تو ہے نہیں......"

جب کبڑے نے یہ بات سنی تو اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا اور اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابل پڑیں۔ وہ گنگ سا ہو گیا اور خاموشی سے ان لوگوں کو نوچنے لگا جو اسے پکڑے ہوئے تھے، اور اس کی بہن کہتی رہی:

"اسی تباہ کن مہم کو، اس گھر کی تعمیر کو لیجیے جسے میرا شہر کو دینے کا ارادہ ہے تاکہ اسے ایک دماغی مریضوں کا ہسپتال بنایا جائے جس کا نام میرے باپ کے نام پر رکھا جائے......"

اس پر اس نے زور سے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ لوگ اسے اٹھا کر لے گئے۔

اس کی بہن نے اس عمارت کو اس تیزی سے ختم کروایا جس تیزی سے اس

نے اسے شروع کیا تھا اور جب عمارت بن کر تیار ہوگئی تو اسے پہلے مریض کی حیثیت سے وہاں بھیجا گیا۔ اس نے سات سال وہاں گزارے، جو پاگل ہو جانے کے لیے کافی مدت ہے۔ اسے مالیخولیا کی شکایت پیدا ہوگئی۔ اسی دوران میں اس کی بہن بوڑھی ہوگئی، اس نے ماں بننے کی تمام امیدیں چھوڑ دیں اور جب آخر کار اس نے دیکھا کہ اس کا دشمن مر چکا ہے اور اب کبھی اس میں جان نہیں پڑے گی تو اس نے اسے اپنے سائے تلے لے لیا۔

اور اس طرح یہ لوگ کرۂ ارض پر مارے مارے پھرتے ہیں، یہ اندھے پرندوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے رہتے ہیں اور ہر چیز پر بے کیف اور مسرت سے نا آشنا نگاہیں ڈالتے ہیں اور کبھی کہیں اپنے سوا اور کسی چیز کو نہیں دیکھتے۔

ضروری کتابیں ہر گھر اور لائبریری کے لئے

گل خان نصیر

- کوچ و بلوچ
- تاریخ خوانین قلات
- بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار
- بلوچستان قدیم وجدید تاریخ کی روشنی میں
- تاریخ بلوچستان

طاہر بزنجو

- گریٹ گیم اور بلوچستان
- بابائے بلوچستان بلوچ کیس

شکیل احمد بلوچ

- بلوچستان اور عالمی سیاست
- بلوچستان کی پکار

بلوچستان کے قبائل

- بلوچستان کے قبائل (مکمل)
- کوئٹہ، پشین، ژوب (1)
- ساراوان، کچھی، بولان اور جھالاوان (2)
- لسبیلہ، لورالائی، سبی اور مری بگٹی (3)
- چاغی، خاران، مکران (4)
- بلوچ پشتون قبائل۔ شجرہ (5)
- بلوچستان قوم نسل اور تاریخ
- بلوچستان تاریخ کے آئینے میں
- بلوچستان اور استعماری ہتھکنڈے
- تاریخ بلوچ قوم وخوانین بلوچ
- بلوچستان کی معروف شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا (3 جلد)
- ثقافت وادب وادی بولان میں
- بگٹی نامہ (دو جلد)
- شہید بلوچستان نواب اکبر بگٹی حیات ومضامین
- نواب شہباز اکبر بگٹی زندہ ہیں
- نواب اکبر بگٹی شہید عوام کا خراج
- نواب اکبر بگٹی قتل کیوں کیا گیا
- خود اختیار کردہ جلاوطنی
- مقصد حیات (سوانح غوث بخش بزنجو)

شاہ محمد مری

- بابو شورش
- ہوچی منہ
- ماؤزے تنگ
- وفا کا تذکرہ
- کارواں کے ساتھ
- شاہ عنایت شہید
- عبداللطیف بھٹائی
- گل خان نصیر
- بلوچ قوم
- مری بلوچ جنگ مزاحمت

عابد میر

- بلوچ کیس
- بلوچستان کا عکس
- سلگتا بلوچستان
- آرٹ آف وار
- تاریخ قلات
- تاریخ بلوچان ہند
- مری بلوچ کلچر
- مکران
- تاریخ بلوچستان
- سیستان اور بلوچستان
- مہمات بلوچستان
- بلوچستان کے بلوچی شعراء
- بلوچستان مسئلہ کیا ہے
- نواب خیر بخش مری انٹرویو
- قومی تحریکیں اور بلوچستان
- چاکر اعظم
- پاکستان، بلوچستان شاہی جرگہ
- افغانستان تاریخ کا سفر
- احمد شاہ درانی
- پشتونوں کی تاریخ
- پشتونوں کے رسم ورواج

تراجم

خلیل جبران

- النبی، جنت ارضی
- دیوانہ، خطوط جبران
- الم وانبساط، ابن آدم
- طوفان، ارضی دیوتا
- فلسفہ، شاعری، نظمیں
- خواب وخیال
- کلیات جبران (3 جلد)

گرو رجنیش اوشو

- کلیات اوشو
- تعلیمات
- روحانیت کی جانب
- علم انقلاب اور آزادی
- زندگی موت اور محبت
- زرتشت
- سگ پرست
- آزادی کا افق
- افتادگان خاک
- داستان ہٹلر (2 جلد)
- جنگ عظیم دوم
- عالمی ادب سے انتخاب۔ ٹالسٹائی
- عالمی ادب سے انتخاب۔ چیخوف
- عالمی ادب سے انتخاب۔ گورکی
- عالمی ادب سے انتخاب۔ پشکن
- موپساں کے افسانے
- سرگزشت اسیر
- فلسفہ افلاطون
- آزادی ہند کی کہانی مولانا آزاد کی زبانی
- خامہ بہ جوش
- سارے سخن ہمارے (کلیات ساحر)
- بلونت سنگھ کے افسانے